جاں نثار اختر حیات اور ادبی خدمات

پیش کردہ

رضوانہ خاتون

ریسرچ اسکالر

ڈاکٹر رام منوہر لوہیا اودھ یونیورسٹی فیض آباد

نگراں:

ڈاکٹر محمد نسیم خاں

ریڈر شعبۂ اردو بابا برووا داس پی۔جی۔کالج۔پروئیا آشرم امبیڈکر نگر

JAN NISAR AKHTAR HAYAT AUR ADBI KHIDMAT

THESIS SUBMITTED TO
Dr. RAM MANOHAR LOHIA AVADH UNIVERSITY
FAIZABAD

FOR THE DEGREE OF

DOCTOR OF PHILOSOPHY
IN
URDU

Submitted By :

Rizwana Khatoon

Under Supervision :

Dr. Mohd. Naseem Khan
Reader Deptt. of Urdu
B.B.D.P.G. College Paruiya Ashram
Ambedkar Nagar

DEPARTMENT OF URDU
Dr. RAM MANOHAR LOHIA AVADH UNIVERSITY
FAIZABAD

2004

JAN NISAR AKHTAR HAYAT AUR ADBI KHIDMAT

THESIS SUBMITTED TO
Dr. RAM MANOHAR LOHIA AVADH UNIVERSITY
FAIZABAD

FOR THE DEGREE OF

DOCTOR OF PHILOSOPHY
IN
URDU

Submitted By :

Rizwana Khatoon

Under Supervision :

Dr. Mohd. Naseem Khan
Reader Deptt. of Urdu
B.B.D.P.G. College Paruiya Ashram
Ambedkar Nagar

DEPARTMENT OF URDU
Dr. RAM MANOHAR LOHIA AVADH UNIVERSITY
FAIZABAD

2004

جاں نثار اختر

بسم الله الرحمن الرحم

ترتیب

صفحہ نمبر

پیش لفظ

ایک ممتاز ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے جاں نثار کی شخصیت خاصی جانی پہچانی اور متعارف ہے۔ ان کی مقبولیت عوامی سطح سے بڑھ کر جو برِّصغیر کے ادبی حلقوں میں بھی خاطر خواہ پذیرائی حاصل کر چکی ہے۔ آفاق حسین صدیقی اور کشور سلطان جاں نثار اختر پر کتابیں اور ان کے فن اور شخصیت پر رسالہ جاں نثار اختر نمبر ان کی مقبولیت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

زیر نظر مقالے میں جاں نثار اختر کے شعری اور نثری سرمائے اور ان کی مقبولیت کے اسباب کے معروضی مطالعہ کی سنجیدہ کوشش کی گئی ہے۔ اور ان کے کلام کو نقد و تجزیہ کے عمل سے گذار کر جاں نثار کے فنی نقوش واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مقالے کے باب اول میں جاں نثار کی داستان حیات لکھنے کے سلسلے میں ان کے خاندانی پس منظر، حسب ونسب، گھریلو ماحول اور ادبی فضا، تعلیم و تربیت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب میں جاں نثار کے ادبی کوائف، خصائص، عادات، واطوار، اخلاقی حالت شاعری کا آغاز اور اس کے محرکات، اور ذریعہ معاش اور فکر معاش میں سرگردانی وغیرہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس باب کے آخر میں جاں نثار کی ممبئی میں دربدری، تنگئی معاش کے ذکر کے ساتھ فلمی دنیا سے وابستگی کے زمانہ میں قدرے مطمئن زندگی کے حالات اور ان کی بے حد عزیز اہلیہ صفیہ کی موت کا دردناک سانحہ، خدیجہ اسے عقد ثانی اور ایک نئی زندگی کا آغاز کی کہانی داخلی اور مستند شواہد کی روشنی میں پیش کیے گئے ہیں۔ حالات قلمبند کرنے کے سلسلے میں پوری تحقیق و تفتیش سے حالات واقعات کو چھان بین کر ہی پیش کیا گیا ہے۔ وہ تمام شواہد یا معلومات جو دوران تحقیق مجھے حاصل ہوئی ہیں ان کو بعینہ تسلیم کر لینے اور قلمبند کر دینے کے بجائے مختلف گوشوں سے اس کا تحلیلی جائزہ لیکر ہی حالات قلمبند کرنے

کی کوشش کی گئی ایسے واقعات یا شہادتیں جو میرے نزدیک معیار تحقیق پر کھری نہیں اتریں انھیں ترک کر دیا گیا ہے۔ باب کے آخر میں جاں نثار اختر کی علالت اور پھر ان کی وفات کا حال تفصیل سے لکھا گیا ہے باب دوم میں جاں نثار کے سماجی، معاشرتی، سیاسی اور ادبی موحول کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اس باب میں جاں نثار کے گرد وپیش کی سماج کا جائزہ لیتے ہوئے جاں نثار اختر کا اس سے رابطہ اور تعلق پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ جاں نثار اختر نے جس دور میں آنکھ کھولی اور اپنے فن کو پروان چڑھایا وہ سیاسی طور سے ملک میں افراتفری اور بدامنی کا دور تھا۔ ہندوستان پر انگیریز قوم کی حکمرانی اور ان کے ناروا سلوک نے ان کے خلاف نفرت و تشدد کی آگ بھڑکا دی تھی۔ اس آتش انقلاب کو فرد کرنے کے لیے سامراجی طاقتیں پوری طرح ظلم وتشدد پر آمادہ ہوکر ہندوستانی عوام کو استحصال کی ہر ممکنہ کوشش میں مصروف تھیں۔ غرضکہ ملک میں ہر طرف ایک بدامنی کا دور تھا۔ سیاسی اور معاشی صورت حال بد سے بدتر ہوتی جارہی تھی۔ ان حالات میں ترقی پسند تحریک۔ علیگڈھ تحریک اور دوسری انجمنوں کے ادب پر کیا اثرات مرتب ہورہے تھے ان سب کو تحقیق اور چھان بین کر کے ہی قلمبند کیا گیا ہے۔

باب سوم میں اختر کی نظموں، غزلوں اور شخصی مرثیوں اور ان کے بنیادی تصورات، رومانیت آزادی اور انقلاب پسندی، اشتراکی نقطہ نظر اور دیگر موضوعات کی عمومیت اور ہستی حضائص کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ ان کی شاعری کے اس سرمایہ روشنی میں اختر کے نظریہ فن کو بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ جاں نثار کی شاعری کا سب سے اہم عنصر ان کے شخصی مرثیے ہیں جن میں ان کا فن پوری طرح ایک بلندی پر نظر آتا ہے۔ غالبًا جاں نثار اختر پہلے ترقی پسند شاعر ہیں جنھوں نے عوامی مسائل حیات کو اپنی نظموں میں جگہ دی اور ایسی شخصیات کو اپنی تحسین سے نوازا

ہے جن کا تعلق حیاتی اور جذباتی زندگی سے استوار رہا ہے۔غزلوں میں جاں نثار کے رومان کی جھلک کے ساتھ ان کی نگاہ میں عورت کی عظمت کی تصویر اور اس کی اہمیت کو نمایاں کیا گیا ہے۔

باب چہارم میں جاں نثار اختر کے گیتوں رباعیوں اور قطعات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ رباعی کا ایجاد اختر رباعی کے اوزان اور بحر کا ذکر کر کے ملک کے عظیم رباعی کہنے والوں کا ذکر کرتے ہوئے جان نثار کے دور سے تعلق رکھنے والے مشہور رباعی کو شعرا مثلاً جوش، رواں اور فراق وغیرہ کی رباعیوں کی روشنی میں جاں نثار کی رباعیوں کا جائزہ لیکر ان کی رباعیوں کے بنیادی اوصاف کو ظاہر کیا گیا ہے۔گیتوں میں ان کی رومانی پر ور فطرت کا عکس، حالات کی ہیئت اور عصر آ گہی اور سماجی مسائل کو جگہ دینے کے رجحان کا بھی ذکر کرتے ہوئے ان گیتوں کا معروضی جائزہ لیا گیا ہے۔قطعات حالانکہ جاں نثار نے بہت ہی کم لکھے ہیں لیکن اس قلیل تعداد کے باوجود وہ کسی طرح دوسرے قطعہ کہنے والے شعرا کے قطعات کے ہم پلہ ہیں۔اور کس قدر ان کی رباعیاں اور قطعات انسانی زندگی سے قریب ہیں سب پر حتی الوسع سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

باب پنجم میں جاں نثار اختر کے مضامین جو وقتاً فوقتاً بلٹر ز بمبئی اور اذکار بھوپال جیسے رسائل کی زینت بنے ان سب کا جائزہ لیا گیا ہے۔خصوصیت کے ساتھ مضطر خیر آبادی کی ہندی شاعری سے متعلق جاں نثار کا مضمون آنے والے قلمکاروں کے لیے تنقید و جائزے کی ایک لائق ستائش کی نشاندہی کرتا ہے۔کالم نویسی کے سلسلے میں ''ہزاروں باتیں'' جو ان کی شخصی زندگی سے متعلق ہیں ان کا بھر پور ذکر کیا گیا ہے اور جن شاعروں اور ادیبوں کا ذکر انھوں نے شامل مضمون کیا ہے اس میں کہاں تک جاں نثار اختر نے منصفی کی ہے ان سب امور کا بالتفصیل جائزہ لیا گیا ہے۔تبصرہ اور تنقید و کے سلسلے میں ان کے شعور مطالعہ اور مشاہدہ کے درس آفرین نتائج

کے آئینہ ہی ان کی تنقیدی بصیرتوں کو کھل کر بیان کرتے ہوئے بحیثیت ایک نقادان کے مرتبہ کو مختص کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

باب ششم جاں نثار کے کلام کے مجموعی جائزے سے متعلق ہے۔اس باپ میں پچھلے سبھی ابواب کی روشنی میں جاں نثار کی نظموں گیتوں غزلوں رباعیوں قطعات اور گیتوں کے بالا سقاب اور مرتکز آمیز مطالعہ کے بعد اختر کی فنی صلاحیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔نثر نگاری کے سلسلے میں جاں نثار کی کالم نویسی، خطوط، مضمون نویسی، تبصرہ اور تنقید نگاری پر ان کی تقاریر ترقی پسند مصنفیں کے اجلاس میں سب کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے نثر نگاری کے سلیقہ کو ظاہر کرتے ہوئے یہ واضع کیا گیا ہے شاعری کی دنیا کے اختر اگر اختر تابندہ ہیں تو نثر کے آسمان ان کا مرتبہ نجم الثاقب کی نوع کا ہے۔

باب ہفتم اس مقالہ کا حرف آخر ہے۔اس مختصر سے باب میں نہایت اختصار کے ساتھ اختر کے شعری محاسن پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی بحیثیت شاعر مرتبہ کا تعین کیا گیا ہے اور ان کی نثر کے آئینے میں ان کی منفرد النوع نثری صلاحیتوں کو پوری طرح نمایاں کرنے اور بحیثیت نثر نگار، نقاد، مبصر، ان کا اردو ادب میں کیا مرتبہ ہے اس پر تفصیل سے لکھا گیا ہے اس باب میں اختر کی مجموعی علمی ادبی خدمات کے تمام پہلوؤں کا بالتفصیل ذکر کرنے کے بعد ان کی مختلف تحقیقات کے تعین قدر انتہائی دشوار گذار مرحلہ سے گذر کر اپنا تنقیدی فریضہ ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ راقم السطور نے پہلی بار اس مشہور عام معروضہ کی بطلان کی کوشش کی ہے کہ جاں نثار کی شاعری ہنگامی موضوعات سے عبارت ہے اپنے ابطال کی کوشش کا مدلل ثبوت بھی فراہم کیا گیا ہے۔

آخر میں اپنے نگراں جناب ڈاکٹر محمد نسیم خاں صاحب ریڈر شعبۂ بابا بروا داس پی جی

کالج پروئیا آشرم کی انتہائی ممنون ہوں جنھوں نے اپنی مدد سے فرُزن علمی اور تدریسی مصروفیات اور سماجی ہنگامہ آرائیوں کے باوصف مجھے اپنے مفید اور گران قدر مشوروں سے نوازا اور ہمیں صحیح ماخذات تک رسائی کی راہ دکھائی۔ میری صلاحیتوں کا اندازہ کرتے ہوئے مجھے ہر طرح کا تعاون دیکر اور میرے مقالے کو باریک بینی سے پڑھکر اپنے مفید مشوروں سے نواز کر مجھے آج اس قابل کیا ہے کہ میں اپنی اس تحریر کو ارباب نظر ونگاہ کے روبرو پیش کرنے کی ہمت کر رہی ہوں۔ اور سب سے زیادہ میں اپنی عزیز ماں کی کرم فرما ہوں کہ جس نے اپنی مجبوری اور پریشانیوں کے باوجود بیش بہا وقت دے کر مجھے اعلی تعلیم حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا میں ان کی تہہ دل سے شکر گذار ہوں۔

رضوانہ خاتون

(ریسرچ اسکالر)

(باب اول)

جاں نثار اختر کا سلسلۂ نسب اور سوانحی حالات

(۱)

اضلاع اودھ کے جن قصبات یا شہروں کو تاریخ ساز اہمیت اور شہرت نصیب ہوئی ان میں خیرآبادی ضلع سیتاپور کا نام سرفہرست ہے جو اپنی ادبی۔ ثقافتی اور مذہبی تاریخ کے حوالے سے ہمیشہ یاد کیا جائے۔ ان ہی قصبات شہروں اور قریوں سے ایسے باکمال شاعر وادب صوفی اور بزرگ ابھرے جنھوں نے اپنی گوناگوں صفات فن اور صلاحیتوں سے اپنے فضل وکمال اور روحانیت کی دھاک جمادی ہے۔ انھوں نے علم وادب کی ایسی قندیلیں روشن کیں جو آج مینارۂ نور بن کر ہماری رہنمائی کررہی ہیں۔

خیرآبادی اودھ کے دارالخلافہ لکھنؤ سے بجانب مغرب سیتاپور کا ایک مردم خیز قصبہ ہے۔ جو ایک مدت مدید سے علمائے طریقت، باکمال صوفیوں، بلند مرتبت علماء وفقہا اور علم وادب کے باکمالوں کا مسکن رہا ہے۔ خیرآباد جنگ آزادی کے مجاہدوں، علم دین، منقولات و معقولات، منطق وفلسفہ اور تزکیہ نفس کی خانقاہوں کا مرکز بھی رہا ہے۔ بزرگ علامہ فضل الحق خیرآبادی، مخدوم شیخ سعد، شیخ موسیٰ، شاہ غلام نبی، مولانا افضل امام اور شمس العلماء مولوی عبد الحق وغیرہ ایسی شخصیات نے ذرات خیرآباد کو روحانیت کی وہ چمک عطا کی جو مدتوں سے سرمہ چشم اعتبار کا درجہ رکھتی ہے۔ اکابرین دین وادب کے علاوہ دوسرے اور بہت سے علماء وفضلا مثلاً شاہ محمد علی مخدوم نظام الدین۔ مرزا حاجی صفت اللہ مولانا عبدالواحد اور مولانا احمد اللہ وغیرہ نے بھی اس قصبہ کو روشن عطا کر کے اس کی چمک اور عظمتوں کو دوبالا کر دیا ہے۔ شاہ معشوق علی، شاہ احمد علی اور شاہ غلام نبی کی بزرگی خداترسی کشف وکرامت علم وکمال میں عالمگیر شہرت کے حامل گذرے ہیں۔

ان بزرگان دین اور روحانی متع فضل وکمال وتقویٰ زاہد و پاکباز مرتاض کو متقی شخصیات

کے علاوہ خیر آباد کی اعلیٰ قدر ادبی ہستیوں میں ریاض خیر آبادی، وسیم اور مضطر خیر آبادی وغیرہ کے اسمہائے گرامی نا قابل فراموش ہیں۔ انھوں نے نہ صرف ملک کے طول عرض میں مقبولیت اور شرف قبولیت حاصل کیا بلکہ دنیائے اردو ادب میں بلند مقام حاصل کیا۔ ان کے رشحات قلم ہمیشہ نہایت قدر و منزلت سے دیکھے جائیں گے۔

خیر آباد شرفا ایک نو مور قدیم بستی ہے جن کے خانوادے میں زہد و تقویٰ کی شاندار وایت رہی ہے مضطر خیر آبادی کا شمار بھی انھیں شرفا میں ہوتا ہے۔ ان کا پورا خاندان ہمیشہ سے گہوارہ علم و ادب اور شیدائے حصول علم رہا ہے۔ مضطر خیر آبادی کے جد اعلیٰ تفضّل حسین مرزا غالب کے بے تکلف دوست تھے۔ وہ پاک سیرت ستھرے ذوق ادب اور بذلہ سنجی کے لیے مشہور تھے۔ اسی خاندان کے دوسرے اہم بزرگوں میں سید یادگار حسین نشتر، سید اعتماد حسین برتر کے نام بھی لیے جا سکتے ہیں۔ جنھوں نے شعر و ادب کے میدان مین اپنے منفرد نقش قدم مرتسم کیے اور ملک گیر شہرت و ناموری حاصل کی۔ جاں نثار اختر نے اس ادبی اور علمی گھرانے میں آنکھ کھولی، ان کے پردادا تفضّل حسین بسلسلۂ ملازمت ریاست (راجستھان) سے منسلک تھے۔ نواب امیر الدولہ محمد امیر خاں بہادر کے مدیر آرائے مملکت ہونے کے بعد وہ بحیثیت سفیر مقرر کیے گئے۔ اپنے حسن تدبر، معاملہ شناسی، دانشمندی علم و فراست کی بدولت جلد ہی انھوں نے امتیازی حیثیت بنالی تھی۔ تفضّل حسین کو شعر و ادب کا بھی پاکیزہ ذوق تھا اپنے زمانے کے گراں قدر شعراء مثلاً مرزا غالبؔ سے ان کے گہرے روابط تھے۔ انھیں کی ایما پر انھوں نے والی ریاست کی شان مٰں ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا تھا۔ جو انھوں نے عید الضحیٰ کے موقع پر حضور میں گذارا تھا مالک رام نے اپنے ایک مضمون میں اس قصیدے کا مفصل ذکر کیا ہے اور یہ بھی ذکر کیا

ہے کہ

''مرزا غالبؔ اس قصیدے کے عوض ملنے والے انعام سے ہمیشہ
میر تفضّل حسین کے احسان مند رہے۔''[۱]

میر تفضّل حسین کا انتقال ۱۲۷۰ھ میں ہوا۔ مرزا غالب نے انکی موت سے متاثر ہوکر اپنے ایک مکتوب بنام گوپال تفتہ میں اپنے رنج اور اس سانحہ کا اظہار کیا ہے۔

ہائے تفضّل حسین خاں ہائے ہائے رفتی و مرا خبر نہ کردی
ہر بیکسم نظر نہ کردی[۲]

اس خط میں آگے لکھتے ہیں میر احمد حسین بڑا بیٹا انکے کام پر فائز ہوا اور میر ارشاد حسین بد ستور نائب رہے غالبؔ نے تیرہ اشعار کا ایک قطعہ تاریخ وفات پہ بھی کہا تھا۔

''میر تفضّل حسین کے بھائی میر ارشاد حسین بھی ریاست ٹونک سے وابستہ تھے انکی حیثیت وکیل دربار کی تھی انکی کارکردگی سے خوش ہوکر محمد علی دائی ٹونک نے انھیں معتمد خاں کے لقب سے بھی سرفراز کیا تھا میر احمد حسین ایک نامور عالم دین ہونے کے ساتھ قدیم فارسی اور اردو شاعری کو بہت پسند کرتے تھے۔ مشاعروں کے اہتمام النصرام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ یہ میر تفضّل کے بڑے بیٹے اور جاں

۱۔ مضمون ذکر غالبؔ محررہ مالک رام مشمولہ آج کل دہلی ۱۹۹۳ء

۲۔ اردو معلٰی ص ۵۵ مکتوب بنام ہرگوپال تفتہ مورخہ ۲۳ فروری ۱۸۰۴ء مطبع فاروقی دہلی ۱۹۰۸ء

نثار اختر کے دادا تھے قابل قدر عالم دین ہونے کے علاوہ حافظ قرآن بھی تھے۔ اردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے انھوں نے رسوا تخلص اختیار کیا تھا ان کی شادی علامۂ وقت فضل الحق خیر آباد کی بڑی بیٹی سیدہ النساء سے ہوئی تھی۔ جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ایک خوش فکر شاعرہ بھی تھیں اور حرمان تخلص کرتی تھیں میر احمد حسن کے بڑے بیٹے سید محمد حسین کی ولادت خیر آباد میں ۱۸۴۹ء میں ہوئی تھی۔ آنکھ کھول کر والد والدہ دونوں کو شاعری کرتے پایا۔ اس شاعرانہ فضا سے بھلا وہ کیسے متاثر نہ ہوتے۔ چنانچہ اوائل عمر ہی سے شاعری کی طرف ان کی رغبت ہوگئی تھی۔ ابھی ان کی عمر عزیز سات آٹھ ہی کی تھی کہ ۱۸۵۷ء کی انگریزوں کے خلاف ناکام جنگ کرنے کی پاداش میں علامہ فضل حق خیر آبادی کے پورے خاندان کو انگریزوں کے عتاب کا ثمرہ بھگتنا پڑا جس کی پاداش میں ان کی جائداد و املاک بحق انگریز ضبط کر لی گئی اس بلائے ناگہانی سے فضل حق کے خاندان کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔ بادل ناخواستہ افراد خاندان کے جائے عافیت کی تلاش میں خیر آباد سے مہاجرت اختیار کر کے دوسرے شہروں کا رخ کیا۔ سید محمد حسین دہلی چلے گئے اور اپنے ذوق کی آبیاری اور فن شعر گوئی کو ترقی دینے کے خیال سے با قاعدہ مرزا غالب کے روبرو زانوئے تلمذ تہ کیا اور شاعری میں بسمل تخلص اختیار کیا تھا۔ وہ غالب سے ان کی حیات تک اصلاح لیتے

رہے۔ اور غالب کی وفات ۱۸۹۹ء کے بعد پھر کسی کے شاگرد نہ ہوئے۔ حالانکہ اس زمانہ میں داغ دہلوی اور امیر مینائی کا شاعری میں کافی شہرہ تھا لیکن ابتدا میں وہ کسی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ بعد میں دوران قیام ریاست ٹوک امیر مینائی کے ایک شاگرد خاص حکیم عابد کوثر کے کہنے سننے سے بسمل بھی امیر مینائی کے شاگرد ہو گئے تھے۔ ۱

''میر محمد حسین حافظ قرآن اور ایک نیت سیرت کے مالک تھے۔ ۱۸۹۰ء میں ان کی کارکردگی سے خوش ہوکر نواب محمد ابراہیم علی والی ٹوک نے انھیں اپنا میر منشی مقرر کر لیا تھا۔ ابراہیم علی خاں والی ٹوک شاعری کا ذوق رکھتے تھے اور بروایت رام بابو سکینہ'' والی ٹونک نواب محمد ابراہیم علی خاں خلیل تخلص کرتے تھے۔'' ۲

محمد حسن بسمل کی شاعری اور امیر مینائی کی شاگردی کے سلسلے میں سید وہاج الدین اشرف لکھتے ہیں۔

''بسمل خیر آبادی امیر مینائی کے شاگرد تھے ۱۸۹۶ء میں ملک الشعرا اور لسان الملک کا خطاب ملا ان کو تصوف سے کافی لگاؤ تھا۔ اسی لیے ان کے کلام میں عارفانہ مضامین کی بہتات نظر آتی ہے اور انھوں نے عمر کے آخری حصہ میں اپنی فکر رسا اور جودت طبع کے اظہار کے لیے حمد و نعت کو وسیلہ بنایا تھا۔'' ۳

---

۱ جاں نثار اختر حیات اور فن ص ۲۳ کشور سلطان ۲ تاریخ ادب اردو رام بابو سکسینہ تیج کمار پریس لکھنؤ

۳ جاں نثار اختر حیات اور ادبی خدمات ص ۳ مقالہ مخطوطہ وہاج الدین

''کشور سلطان کے مطابق میر محمد حسین کو خواجہ معین الدین چستی سے بے پناہ عقیدت تھی۔ چنانچہ آخر عمر میں ملازمت ترک کر کے اجمیر شریف میں سکونت پذیر ہو گئے تھے وہیں۔ ۱۳۱۴ھ/ ۱۹۰۰ء میں انتقال ہو گیا اور وہ اپنے محبوب کے شہر میں دفن ہو گئے۔''

جاں نثار اختر کے والد کا نام محمد افتخار حسین تھا شاعری کا شوق تھا اور مضطر تخلص کرتے تھے۔ مضطر محمد حسین بسمل کے چھوٹے بھائی تھے۔ مضطر کی والدہ سیدۃ النساء تھیں ادب اور شعر کے نکات پر ان کی گہری نگاہ تھی۔ ان کی آغوش عاطفت مین مضطر کی تربیت اور ابتدائی تعلیم ہوئی۔ رواج زمانہ کے مطابق مضطر نے بھی اردو فارسی سے تعلیم کا آغاز کیا۔ مضطر کی والدہ جیسا کہ ذکر کیا گیا خوش فکر اور اچھی شاعرہ تھین اس وجہ ان کے ذوق شعر گوئی کا اثر مضطر پر بھی خاطر خواہ پڑا چنانچہ قلیل عمر ہی سے وہ شعر موزوں کرنے لگے تھے۔ اور اپنے کلام پر اپنی والدہ سے اصلاح لیتے تھے۔ اور جلدی ہی ایسی مشاقی بہم پہونچالی تھی کہ محض گیارہ سال کی چھوٹی عمر میں ہی شعری محافل میں حصہ لینے لگے تھے۔ بعد میں مضطر نے اپنے بھائی بسمل خیر آبادی شاگرد غالب سے اصلاح لینا شروع کی بسمل خیر آبادی پر غالب کا رنگ گہرا تھا۔ نیز یہ کہ مضطر کا فطری طور سے رحجان تصوف اور عشق حقیقی کی طرف زیادہ تھا۔ اور مضطر کا ذوق عشق کے خارجی لوازم و کیفیات۔ معاملہ بندی کے جذبہ کا برملا اظہار کی جانب تھا اس تضاد ذوق اور فکر کے بعد کی بنا پر دلی طور سے بسمل کی اصلاح سے مطمئن نہیں تھے۔ اس زمانے میں داغ دہلوی اور امیر مینائی کا شاعری میں طوطی بول رہا تھا۔ مضطر نے اپنے بھائی بسمل کی طرح امیر مینائی کو اپنا کلام بغرض اصلاح بھیجنا شروع کیا۔ اس اعتبار سے انھیں امیر مینائی سے بھی شرف تلمذ حاصل تھا۔ مضطر بھی اپنی خاندانی روایت کے مطابق ریاست ٹوک میں ملازم ہو گئے۔ ۱۸۹۲ء میں نواب ٹوک نے انھیں

اودے پور کا وکیل دربار مقرر کیا۔ اس کے بعد کچھ دنوں تک وہ کوہ آبو میں بھی دربار ٹونک کے وکیل کی حیثیت سے اپنے فرائض منصبی پورے کرتے رہے۔ بسمل کی وفات کے بعد والیٔ نگاہ مضطر پر پڑی ان کی صلاحیتوں سے مطمئن ہوکر نواب نے انہیں مشیر سخن مقرر کیا۔

مضطر کو قانون امور اور وکالت سے کافی دلچسپی تھی۔ اور اس کام میں انھوں نے محنت و جانفشانی سے جلدی ہی اپنے پیشہ میں مہارت حاصل کر لی۔ جسے دیکھ کر والی ٹونک نے انھیں ٹونک کا سول جج مقرر کر دیا تھا۔ معلوم نہیں کن وجوہات سے ۱۹۰۴ء میں مضطر ریاست ٹونک سے علیحدہ ہوکر ریاست گوالیار سے منسلک ہو گئے جہاں ان کی بڑی قدر و منزلت ہوئی اور اس نئی ریاست میں کئی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ پہلے انھیں وکیل ریاست پھر صدر لشکر گوالیار کا جج بنا دیا گیا انہوں نے لگ بھگ چودہ سال تک گوالیار میں ملازمت کی بعد میں نواب رام پور نے گوالیار سے ان کی خدمات حاصل کرلیں لیکن یہاں ان کا دل نہ لگا جلدی یہاں سے مستعفی ہو کر مضطر دوبارہ گوالیار پہونچ گئے ۱۹۲۳ء یہاں سے سبکدوش ہوکر وہ حیدر آباد چلے گئے وہاں انھیں نصر اللہ خاں کا جوڈیشنل سکریڑی مقرر کیا گیا۔ عمر کے اختتامی ایام میں مضطر ریاست اِندور کے مہاراجہ ہلکر کے ذاتی عملے میں شامل ہو گئے۔ آخر عمر میں متدعد امراض کے شکار ہو گئے تھے۔ خصوصاً درد شکم سے وہ بہت زیادہ پریشان و آزردہ خاطر رہتے تھے۔ آخر کار ۳۱ / مارچ ۱۹۳۷ء کو دو ماہ بیمار ہو کر فوت ہو گئے۔ مضطر تمام عمر مختلف درباروں کے چکر کاٹتے رہے لیکن شعر و ادب سے لگاؤ میں کبھی کمی انھوں نے نہ آنے دی۔ انھوں نے سبھی اصناف سخن مثلاً غزل، نظم، گیت اور دوہے میں اپنی فکر رسا کے جوہر دکھائے۔ اپنے زمانے میں ان کا شمار اساتذہ میں ہونے لگا تھا۔

''مضطر راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ گھر میں بزرگوں کی نذر و نیاز
کا برابر کا اہتمام رہتا تھا۔ ہر سال محفل میلا دنبوی صلعم کا انعقاد ہوتا۔
جس میں شہر کے بزرگ و سنجیدہ اشخاص شرکت کرتے۔ ان محافل کے
لیے ہر سال مضطر ایک نئی نعت پیش کرتے تھے۔ اس طرح یہ سرمایہ نعت
اتنا بڑھ گیا کہ دو نعتیہ دیوان مرتب ہو جائیں۔'' [۱]

مضطر کی مذہبی شاعری کے دو مجموعے نذر خدا اور نیاز مصطفٰے شائع ہوئے ہیں۔ شاعری کے علاوہ نثر میں بھی مضطر نے اپنی جالانی طبع کے جوہر دکھائے ہیں۔ ان کا ناول قتیل جفا ادبی حلقوں میں بہت زیادہ مقبول ہوا پروفیسر آل احمد سرور مضطر کے فن شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''مضطر خیر آبادی نے ہمارے کلاسیکی رنگ کے حسن ورچاؤ پختگی
اور شگفتگی کو جس البیلے انداز میں اپنے اشعار میں سمولیا تھا۔ اس سے
ارباب نظر اچھی طرح واقف ہیں۔'' [۲]

مضطر ایک کثیر المشق اور قادر الکلام شاعر تھے ان کی شاعری عوام اور خواص دونوں میں مقبول تھی انھوں نے اردو کی روایتی شاعری سے بھی اپنا رشتہ بنائے رکھا، ہولی گیت ٹھمری دوہے بھی خوب کہے نعت میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ان کا شمار دبستان امیر مینائی کے ارشد تلامذہ میں ہوتا ہے فنی پختگی کلاسیکی رنگ کا رچاؤ، زبان و بیان کی صحت و نکات پر ان کی نگاہ تھی۔ فنی نزاکتوں کا لحاظ ان کی شاعری کے اضافی اوصاف ہیں۔

---

[۱] جاں نثار اختر فن اور شخصیت ص ۴۶۳ جاں قدر چغتائی ۱۹۷۶ء (رسالہ)

[۲] مقدمہ پچھلے پہر آل احمد سرور ص ۳

جاں نثار اختر کی ولادت (نام ونسب) :

جاں نثار اختر کا آبائی وطن خیرآباد ضلع سیتاپور تھا۔ ان کے والد عرصے تک گوالیار بسلسلۂ ملازمت مقیم رہے تھے ان کا سلسلۂ نسب خاندان سادات خیرآباد سے ملتا ہے۔ جاں نثار اختر کے والد نے دو شادیاں کی تھیں پہلی بیوی سے ان کی اولادیں ہوئیں۔ یہ دونوں بیٹے سید اعتبار حسین برترؔ اور سید یادگار حسین نشترؔ اپنی خاندانی روایت کے لحاظ سے شاعر تھے۔ دوسری بیوی جن سے مضطر نے زوجۂ اول کی وفات بعد عقد کیا تھا ان کے بطن سے ایک بیٹا بتاریخ ۸؍فروری ۱۹۱۴ء گوالیار میں تولد ہوا۔ جس کا نام جاں نثار اختر رضوی رکھا گیا اس ضمن میں ڈاکٹر انصاری لکھتے ہیں۔

> ''جاں نثار اختر نے گوالیار میں آنکھیں کھولیں (۱۹۱۴ء) چودہ برس کی عمر میں وہ اپنے سخن ور اور ذی علم باپ مضطر خیرآبادی کی سرپرستی سے محروم ہوگئے۔ باپ سٹی مجسٹریٹ اور سشن جج رہ چکے تھے۔ بچے کھچے اثاثہ میں دو پرانی کاریں اور ایک حویلی رہ گئی تھی۔ ایک سگی ماں تھیں۔ اور ایک سگی بہن، ماں کے یہی اکلوتے بیٹے تھے۔'' [۱]

تعلیم وتربیت :

جاں نثار کا خاندان علم وفضل کے اعتبار سے ممتاز تھا ہی۔ گھر کی خواتین عربی فارسی اور اردو میں اچھی دستگاہ رکھتی تھیں۔ گھر کا ماحول پوری طرح مذہبی امور کا پابند تھا آنکھ کھولتے ہی جاں نثار اختر نے دینوی اور شعر وادب کی فضا پائی ایسے میں انکا ان روشنیوں سے کسبِ فیض کرنا

---

[۱] جاں نثار اختر اور ان کی شاعری ص ۴۳ ڈاکٹر انصاری

ناگزیر تھا۔ بقول جہاں قدر چغتائی۔

''ایسے شعری اور مذہبی ماحول میں جاں نثار اختر نے آنکھ کھولی۔ محرم کے دس دن سبز کپڑے پہنتے اور فقیر بنے پھرتے، تعذیوں کی ملا گلے میں پڑی ہوئی سر پر ہر وقت ٹوپی منڈھی ہوئی نماز روزہ نہ صرف ضروری بلکہ لازمی لباس بھی وہی جو عام طور پر مسلمان بچوں کا ہوا کرتا تھا۔ جاڑوں کے مہینوں میں روئی کی موٹی جیکٹ کان کنٹوپ میں چھپے ہوئے۔ تنگ مہری کا پاجامہ اور انگرکھا۔'' [۱]

اس ماحول کا خاطر خواہ اثر ان پر پڑا۔ ابتدائی تعلیم کا آغاز مذہبی کتابوں سے ہوا۔ دستور زمانہ کے مطابق اردو، فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم گھر ہی میں اپنی والدہ سے حاصل کی جیسا کہ پہلے کہ عرض کیا جاچکا ہے۔ کہ جاں نثار اختر کے والد مضطر خیر آبادی بغرض ملازمت مدھیہ پردیش کے مختلف شہروں مثلاً گوالیار، بھوپال، اندور جو اس زمانے میں خود مختار ریاستیں تھیں رہے اور گوالیار میں رہ کر انھوں نے دس سال گذارے جاں نثار اختر نے بھی آئندہ تعلیم کے لیے گوالیار کے وکٹوریہ کالجیٹ ہائی اسکول میں داخلہ لیا اور یہاں سے آرٹس کے مضامین کے ساتھ ہائی اسکول کا امتحان درجہ دوم میں پاس کیا اعلیٰ تعلیم کے لیے والد نے ان کو علی گڈھ بھیج دیا جہاں انھوں نے سائنس کے مضامین فزکس، کیمسٹری اور بایولوجی لیکر انٹرمیڈیٹ کا ۱۹۳۳ء میں امتحان پاس کرلیا۔ جاں نثار اختر کا فطری رجحان ادب کی طرف تھا اس لیے دوبارہ پھر وہ آرٹس کے مضامین انگریزی، اردو اور فلسفہ کی طرف رجوع ہوئے اور انھیں مضامین میں ۱۹۳۷ء میں

---

[۱] جاں نثار اختر فن اور شخصیت جاں نثار اختر نمبر ص ۶۳۔۴ جہاں قدر چغتائی

بی۔اے آرٹس پاس کیا۔ جاں نثار اختر جس زمانے میں علیگڈھ گئے تھے وہاں یونیورسٹی میں اس عہد کے ابھرتے ہوئے شاعر اور ادیبوں کی بھیڑ سی تھی بقول ظ انصاری۔

''علیگڈھ یونیورسٹی وہ ایسے وقت پہونچے جب وہاں نوجوان باغیوں اور مفکروں کی ایک نسل آئن اسٹائن کے سائنسی نظریات مارکس کے فلسفہ انقلاب روس کی گونج۔ اقبال کے آہنگ جوش کے طنطنے آزادئ ہند کے ولوے جواہر لال نہرو کی تقریں انگریزی کے آزادی پسند رومانی شعرا کا کلام اور روسی ادب کی حقیقت پسندی کے ملے جلے منظر سے آنکھیں سینک رہی تھیں۔ دس برس انھوں نے یہیں گذارے اور یہیں سے داد شعر لیا یونیورسٹی کے آخری کورس کی کتابیں سیاسی اور ادبی مسائل پر دانش ورانہ بحثیں مارکس اور اینگلس کا فلسفہ خیرآباد (بزرگوں کا وطن) کی شاندار علمی روایت ہڑتالیں انجمنیں اور پھر آخری امتحان کی تیاری اور تدبیریں بھی اس شامیانے کی طنابیں نہ کاٹ سکیں۔ جس شامیانے میں انھوں نے اندر سبھا سجا رکھی تھی۔'' [۱]

جاں نثار اختر کو بحثییت مجموعی، علیگڈھ کی یہ تعلیمی اور ادبی فضا بہت راس آئی۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی جیسے باکمال استادوں اور ہم جماعت طلباء اور شاعروں کی رفاقت نے ان کی شخصیت میں نکھار پیدا کر دیا تھا۔ سردار جعفری نے اپنے ایک خط مشمولہ خاکۂ دل میں اس وقت کے علیگڈھ کے ماحول کا یوں ذکر کیا ہے۔

---

[۱] جاں نثار اختر اور ان کی شاعری جاں نثار اختر نمبر ص ۲۴۴ مضمون نگار ظ انصاری

''اتنا یاد ہے جب میں ۱۹۳۳ء میں علیگڈھ پہونچا تو وہاں مجاز
خواجہ احمد عباس و سبط حسن اختر حسین رائے پوری حیات اللہ انصاری
موجود تھے کچھ عرصے بعد تھوڑے وقفے سے سعادت حسن منٹو شاہد
لطیف جذبی اختر الایمان وغیرہ بھی آئے۔ ترقی پسند تحریک ابھی شروع
نہیں ہوئی تھی۔ لیکن ہمارے سینوں میں بجلیاں چمک رہی تھیں شاعری
کے آسمان و زمین اقبال اور جوش کی حکمرانی میں تھے انھیں کے ساتھ
ذرا نیچے آسمان پر حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی کے نام جگمگا رہے
تھے۔'' [۱]

بی۔ اے آنرز (اردو) کرنے کے بعد جاں نثار اختر نے ایم اے اردو میں کرنے کا فیصلہ کیا اس وقت یونیورسٹی کا شعبہ اردو پورے ملک میں امتیازی شان کا حامل تھا۔ ممتاز مزاح نگار اور صاحب طرز ادیب پروفیسر رشید احمد صدیقی صدر شعبہ تھے۔ بی اے کے دوران جاں نثار کا کلام یونیورسٹی کے طلباء کی میگزین (علیگڈھ میگزین) شائع ہوئی تھی۔ جس کی ادارت کسی ایم اے سال دوم کے طالب کو تفویض ہوتی تھی۔ مگر ۱۹۳۵ء میں علیگڈھ روایت کے خلاف یہ ذمہ داری مجاز اسرار الحق کو سونپی گئی حالانکہ یہ اس وقت ایم اے سال اول کے ہی طالب علم تھے۔ تھوڑے ہی دنوں مجاز ایک اچھی ملازمت پا کر تعلیم ادھوری چھوڑ کر دہلی چلے گئے۔ اب ارباب اقتدار کی نگاہ انتخاب جاں نثار اختر پر پڑی جو اپنی شاعرانہ اور ادبی سرگرمیوں کی بنا پر طلباء اور اساتذہ دونوں میں پسند کیے جاتے تھے۔ جاں نثار اختر ابھی بی اے کے ہی طالب علم

....

[۱] سردار جعفری بنام جاں نثار اختر مکتوب مشمولہ خاکہ دل

تھے اس وقت علیگڈھ میگزین کے نگراں صدر شعبہ انگریزی اور سخت گیر ناقد پروفیسر منظور حسین تھے لیکن انھوں نے جاں نثار اختر کو ہی مدیر مقرر کر دیا اس (خلاف توقع) انتخاب سے جاں نثار اختر کے ستھرے شاعرانہ کمال اور ادبی ذوق کا اعتراف کہا جا سکتا ہے۔ جاں نثار اختر اس ادارات کے علاوہ علیگڈھ کی ادبی انجمن حدیقۃ الشعراء کے سکریڑی بھی رہے۔ جاں نثار اختر کے خانۂ دل میں پہلے ہی سے پروفیسر رشید احمد صدیقی کی علمیت ان کی نگارشات کا حسن منقش تھا اس بنا پر انھوں نے ایم اے اردو میں کرنے کا تہیہ بھی کیا تھا اور پوری دل جمعی سے امتحان کی تیاری میں بھی مصروف تھے۔ اسے حسن اتفاق ہی کہا جائے کہ عین وقت پر وہ سخت بیمار ہو گئے او ر ۱۹۳۸ء کے امتحان میں شرکت نہ کر سکے۔ لیکن وہ ہمت نہ ہارے اور ۱۹۳۹ء میں پوری تیاری سے امتحان میں شریک ہوئے اور فرسٹ ڈویزن میں اہم اے پاس کرلیا۔ اس کے بعد انھوں نے ۱۹۴۰ء میں ریسرچ میں داخلہ لیا۔ عنوان اردو ناول اور اس کا ارتقا منتخب کر کے اس میں اپنا نام رجسٹر کرا بھی لیا لیکن کچھ ناگزیر قسم کی گھریلو مجبوریوں کے تحت کام ادھورا چھوڑ کر انھین گوالیار واپس جانا پڑ گیا۔ اس طرح یہ تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا۔ گوالیار کے وکٹوریہ کالج میں جلدی ہی ان کا تقرر بحثیت اردو لکچرر ہو گیا۔ اس طرح کا خیال ظ انصاری نے اپنے مضمون میں ظاہر کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

۱۹۴۰ء میں یہ ناز پروردہ شاعر اردو ادب پر ڈاکٹریٹ کا تھیس ناتمام چھوڑ کر گوالیار واپس آیا اور وکٹوریہ کالج میں لکچرر ہو گیا۔''

شادی:۔

ابتدا ہی سے جاں نثار اختر حساس طبع واقع ہوئے تھے۔ ان کے جمالیائی ذوق کو ان کی

بچپن کے واقعات میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ نوعمری میں ہی وہ دلدارگان محبوب اور شیفتگان جن کے زمرے میں اپنا نام لکھوا چکے تھے۔ جہاں قدر چغتائی نے ان کے ایام حسن پرستی کا یوں ذکر کیا ہے۔

''لڑکے لڑکیاں عزیز اور رشتے دار مضطر کے بڑے گھر میں ایک ساتھ رہتے اور کھیلتے تھے جب لڑکیاں سیانی ہونے لگیں تو ان کی باہیں پکڑ کر ان بچوں کی محفلوں سے باہر کھینچ لیا جاتا تھا۔ جاں نثار اختر مذہبی دباؤ تو دیر تک سہہ سکتے تھے لیکن لڑکیوں کو اس طرح آنکھوں کے آگے چھپا دیا جاتا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ اس طرح مذہب اور عشق میں جنگ شروع ہوگئی جاں نثار اختر علیگڈھ چلے گئے اور ان کے ساتھ چلی گئیں لڑکپن کی یادیں اور وہ صورتیں اور شکلیں جو ان کو دل و جان سے عزیز تھیں۔ شاعری تو گھٹی میں پڑی تھی۔ تھوڑے دن بعد اختر کی شاعری میں ایک نیا چہرہ ''ناہید'' نظر آنے لگا لیکن جاں نثار کے لیے یہ چہرہ ہرگز نیا نہیں تھا لڑکپن کا زمانہ اس چہرے سے واقف تھا۔ گھر کے صحن میں آنگن میں کمرے اور دالان میں اس کی آواز گونج چکی تھیں۔ معصوم سی راتیں بجلیاں کوندا کر چلی جا چکی تھیں جاں نثار کی نظموں نے ناہید کے نام کا ڈنکا پیٹ دیا۔ ناہید کے گھر والوں کو نام کا چرچا ایک آنکھ نہ بھایا اور نتیجہ میں محرومی کے سوا جاں نثار کے ہاتھ کچھ نہ لگ سکا انجم کا ظہور جاں نثار کی نظموں میں ہوا۔ کچھ دنوں بعد یہ ستارہ بھی آنکھوں

سے او جھل ہو گیا۔'' ؎۱

اس طرح عشق میں یکے بادیگرے نہ کام رہنے کے بعد جاں نثار نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا لیکن ان کی والدہ اس سے ہرگز متفق نہیں تھیں۔ وہ برابر تاکید کرتی رہیں۔ آخر کار جاں نثار کو ملازمت حاصل ہو جانے کے بعد والدہ کی اس شدت اصرار میں اور اضافہ ہو گیا۔ جاں نثار کی دیرینہ دوست اور ہمراز لکھتی ہیں۔

''۱۹۴۲ء کی بات ہے جاں نثار کی شادی کا سلسلہ گھر مین چھڑا ہوا تھا۔ جاں نثار برابر ٹالتے رہے تھے۔ اس کا سبب انھیں کے بقول'' **کوئی چپکے سے مرا ہاتھ دبا دیتا ہے** '' چاہے رہا ہو چاہے وہ آزادانہ روش ہو جو اپنے رومان کی ناکامی کے بعد انھون نے اختر کر رکھی تھی چچی (جاں نثار کی والدہ) جاں نثار کی رضا مندی کے لیے مجھ سے بھی زور ڈلواتیں اور آخر چند مہینوں کی ردوقدح کے بعد جاں نثار کو سمجھا لینے میں کامیاب ہو گئیں۔ جاں نثار کو بچپن کی نسبت انھیں کے گھرانے میں فیض الحق صاحب کی صاحبزادی سے تھی لیکن وہ اپنی پسند سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ خاصا وقت لے کر آخر انھوں نے اپنا فیصلہ سنا ہی دیا اور یہ قرعہ فال صفیہ کے نام تھا۔'' ؎۲

جاں نثار اختر سے فاطمہ زبیر (پورا نام نگار فاطمہ زبیر) کے کس قسم کے مراسم تھے اس سلسلے میں جاں نثار کے ہم زلف جہاں قدر چغتائی یہ معلومات فراہم کرتے ہیں۔

؎۱ جاں نثار اختر فن اور شخصیت جاں نثار اختر ص ۴۶۳ جہاں قدر چغتائی

؎۲ حرف آشنا دیباچہ فاطمہ زبیر ص ۴۶۴

''جاں نثار اختر کے گھر کے قریب گوالیار میں ایک اور گھر تھا جہاں حکیم مومن خاں مومن کی نواسی فاطمہ زبیر رہتی تھیں۔ تنہا جاں نثار کی دم ساز تھین۔ یہ وہی فاطمہ زبیر ہیں جنھوں نے حرف آشنا کا دیباچہ لکھا ہے۔ اختر اور فاطمہ زبیر ایک طویل عرصہ تک محض دوست اور ہمدرد بنے رہے۔'' [۱]

فاطمہ زبیر ان دنوں پدماودیا کالج میں لکچرار تھیں۔ ان کی افہام وتفہیم اور پر خلوص کوشش سے آخر کار جاں نثار نے اسرارالحق مجاز کی بڑی بہن صفیہ کے ساتھ شادی کر لینے کا فیصلہ کر دیا۔ صفیہ کا تعلق بارہ بنکی کے ایک مردم خیز قصبہ رودولی کے ایک مشہور شریف اور متوسط درجہ کے زمیندار گھرانے سے تھا۔ صفیہ کے والد چودھری سراج الحق سرکاری ملازم تھے وہ بسلسلہ ملازمت یو پی کے کئی شہروں میں رہ چکے تھے۔ آخر انسپکٹر رجسٹریشن کے عہدہ سے ۱۹۳۵ء میں ملازمت رٹائر ہو گئے تھے۔ اس زمانہ میں وہ علیگڈھ میں ملازم تھے۔ ملازمت سے چھٹی پاکر انھوں نے لکھنؤ میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ ان کی پانچ اولادیں اسرارالحق مجاز، انصارالحق (مشہور سیاست داں اور سابق ممبر پارلیمنٹ) دو بیٹے اور تین بیٹیاں عارفہ خاتون، صفیہ بیگم، حمیدہ بیگم تھیں۔ صفیہ کی ولادت ۱۹۱۸ء میں رودولی میں ہوئی تھی۔ ابتدا ہی سے وہ بے حد ذہین اور پڑھنے لکھنے کی بہت شوقین تھیں کتابوں سے شغف اور مطالعہ ان کا ہر وقت کا مشغلہ تھا۔ اس ذوق فطری کی بدولت وہ ہائی اسکول انٹرمیڈیٹ اور بے اے کے امتحانات میں ہمیشہ فرسٹ ڈویزن امتیاز لیکر پاس ہوتی رہیں۔ ایم اے اور بی ٹی کے امتحانات انھوں نے فرسٹ کلاس کے اعلیٰ

---

[۱] جاں نثار اختر جہاں قدر چغتائی جاں نثار اختر نمبر ۴۶۴

معیار اور امتیاز سے پاس کیے تھے صفیہ کا گھرانہ اعلیٰ تعلیم سے بہرور تھا ہی صفیہ کو بھی اپنی مدارج تک پہونچانے میں کوئی دشواری یا گھریلو رکاوٹ درپیش نہیں ہوئی تھی۔ ۱۹۴۱ء میں مسلم یونیورسٹی گرلس کالج میں معاشیات کی لکچرر مقرر ہوئی۔ بعد ازاں ان کا تقرر ٹیچرس ٹریننگ کالج میں ہو گیا۔ چھ برس تک وہ اپنے تدریسی فرائض بڑے سکون اور خوش اسلوبی سے انجام دیتی رہیں۔ حسن اتفاق سے جاں نثار بھی ان ہی ایام میں علیگڈھ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ صفیہ سے ان کی یہیں شناسائی ہوئی اور جاں نثار نے صفیہ کو اپنا شریک زندگی بنانے کا تہیہ کیا...... والدہ کی طرف سے پیام وسلام کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا اور طرفین میں رضامندی بھی ہوگئی۔ لیکن جاں نثار نے پھر کروٹ لی اور شادی کا معاملہ موردالتوئی میں پڑ گیا۔ شاید اس کا خاص سبب جاں نثار کا پہلا عشق تھا جو از سر نو پھر ابھر آیا تھا۔ مگر یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ کشور سلطان لکھتی ہیں۔

> ''جاں نثار اختر صاحب نے ایک ملاقات میں انکشاف کیا کہ صفیہ سے نسبت طے ہونے کے بعد اس میں تاخیر ہوئی اور پھر جو شادی کا ارادہ منسوخ کیا گیا اس کی وجہ یہی تھی کہ شاید انجم سے تجدید پہچان کی نوبت آجائے۔ لیکن حالات ساز گار نہ ہوئے۔ نظم ''زندگی کے موڑ پر'' میں اس طرف واضح اشارہ ملتا ہے''۔ [۱]

ہوسکتا ہے کہ جاں نثار اختر اپنی ناکام محبت کا زخم سینے میں چھپائے ہوئے جب گوالیار پہنچے اور وکٹوریہ کالج میں ان کا تقرر بحیثیت لکچرار بھی ہو گیا۔ لیکن بایں ہمہ احساس شکست نے

---

[۱] جاں نثار اختر حیات اور فن ص ۶۵ کشور سلطان

انھیں غمگین اور افسردہ کر رکھا تھا۔ فاطمہ زبیر ان کی غمگسار بن کر حالانکہ ان کی دلجوئی اور حوصلہ افزائی کرتی تھیں لیکن جاں نثار اختر اس وہم میں غلطاں اور سرگرداں رہتے کہ مبادا صفیہ کو اپنا جیون ساتھی بنالیں اور جب صفیہ پر ان کے اور فاطمہ زبیر کے روابط کا راز افشاں ہو تو پھر بنی بنائی صورت بگڑ جائے کیونکہ عورت بھوک پیاس برداشت کر سکتی ہے لیکن کہاوت ہے کہ چونے کی سوت کو کبھی نہیں برداشت کرتی ہے ہندی کہاوت ہے۔

काँटा बुरा ककेर का और बदरी का घाम

सवत बुरी है चून की और साझे का काम

اس تذبذب میں کافی دن گذر گئے اور اندیشہ فردا نے جاں نثار کو اس راہ میں قدم بڑھانے کی ہمت نہ دی۔ حالانکہ فاطمہ زبیر ان کی دمساز تھیں جیسا کہ ذکر کیا گیا پھر بھی جاں نثار حصار شبہات سے نکل نہ سکے...... ان ہی ایام میں صفیہ نے اپنی طرف سے پہل کی اور جاں نثار کو اپنی طرف سے اطمینان دلاتے ہوئے ۱۹۴۳ء کے ایک مفصل خط میں لکھا۔

''اگر آپ کی گذشتہ زندگی ایک دوست کی نوازشوں کے بدولت جینے کے قابل نہیں رہے اور آئندہ بھی اس دوستی سے آپ کی زندگی میں کسی کمی کے پوری ہوتے رہنے کا امکان ہے تو شاید آپ کی دوستی قابل قبول سمجھنے کے بعد آپ کے اس دوست کی دوستی قبول کرنے میں مجھے مسرت ہوگی...اور بیگم صاحب موصفہ اس محبت کی بنا پر جو انھیں آپ کی ذات سے ہے مجھے خوش آمدید کہنے پر تیار ہیں تو مجھے تشکر کا احساس ہوگا جس کے جواب میں میں محبت کی اس قدر کوشش کروں گی جس قدر ان

کے دوست کو ان سے ہے۔ اور معاوضہ میں ان سے اس قدر محبت کی
توقع کروں گی، جتنی انھیں اپنے دوست سے ہے۔" [1]

صفیہ کا یہ خط پاکر جاں نثار کو بڑی ڈھارس ملی، انھوں نے بھی جواب میں صفیہ کو پوری صورت حال سے واقف کراتے ہوئے آخر کار اس شادی پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔ چنانچہ لکھنؤ میں سراج منزل میں شادی کی ساری تقریبات ۲۵/دسمبر ۱۹۴۳ء کو انجام پذیر ہوگئیں اور صفیہ رخصت ہو کر گوالیار چلی گئی لیکن وہ زیادہ دن یہاں نہ رہ سکی علی گڈھ میں ملازم تھیں اس پابندی کے پیش نظر صرف بیس دن گوالیار میں رہ کر انھیں علیگڈھ واپس جانا پڑا، صفیہ سے شادی کر کے جاں نثار بہت زیادہ مطمئن اور خوش تھے۔ اپنی ایک نظم میں اپنی چاہتوں کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

تیری پیشانی رنگیں میں جھلکتی ہے جو آگ
تیرے رخسار کے پھولوں میں مہکتی ہے جو آگ
تیرے سینے میں جوانی کی دمکتی ہے جو آگ
زندگی کی یہ حسین آگ مجھے بھی دیدے

اس رشتۂ ازدواج میں انسلاک کے باوجود دونوں فراق زدگی کی زندگی پر مجبور تھے۔ صفیہ علیگڈھ میں لکچرر تھیں اور جاں نثار گوالیار میں ملازم۔ وہی مثال تھی کہ "کشتی درچین ع ملاح درخرنگ" اس کا بہت کچھ احساس طرفین کو ہوتا ہوگا۔ اس احساس کی مرقع کشی آفاق حسین

---

[1] حرف آشناص ۲۲ صفیہ (مکتوب بنام جاں نثار اختر) مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی بھوپال ۱۹۸۱ء

صدیقی نے کچھ اس طرح کی ہے۔

''آمد ورفت کا یہ سلسلہ شادی کے بعد تقریباً تین سال دس ماہ تک جاری رہا اور جاں نثار اختر کی ازواجی زندگی اس طرح چلتی رہی۔ کہ کبھی انھیں بیوی کی رفاقت میسر آتی اور کبھی تنہائی کی کوفت اور فراق کی کشمکش سے گذرنا پڑتا صفیہ اختر کو جب موقع ملتا یا جب ان کی تعطیلات ہوتیں وہ علیگڈھ سے گوالیار آجاتیں یا جب جاں نثار کو موقع ملتا وہ علیگڈھ چلے جاتے تو جاں نثار کے دن اطمینان اور سکون سے گذر جاتے ورنہ گوالیار کی بے رونق زندگی غیر ادبی ماحول اور خشک فضا کے لیے شدید ذہنی کوفت کا باعث تھی۔ یہاں نہ ادبی محفلیں تھیں نہ وہ صحبتیں جن میں انھیں ذہنی آسودگی کا سامان میسر آ سکتا نہ ہی وہ علم ہی تھا جو تشنگی کی تسکین کا باعث ہوتا''۔ [۱]

جاں نثار اختر کو صفیہ سے بے پناہ محبت تھی۔ کسی وقت بھی ان کی جدائی ان کو بہت شاق گزرتی اکثر صفیہ سے کہتے ملازمت چھوڑ دو اور ہمارے پاس ہی رہو۔ صفیہ حالات کی تنگ سامانی کا انھیں احساس دلاتیں اور دوراندیشی اور فکر مستقبل کی خاطر ملازمت چھوڑنے کے لیے بھی آمادہ نہ ہوتی تھیں۔ حالانکہ وہ خود بھی جاں نثار کو دل و جان سے زیادہ چاہتی تھیں۔ فراق زدگی کی زندگی ان کو ایک آنکھ نہ بھاتی۔ مگر حالات کی مجبوری کی بنا پر انس ولگاؤ کی اس ندی کے دونوں کنارے ملنے سے مجبور تھے۔ اپنے ایک مکتوب بنام جاں نثار لکھتی ہیں۔

---

[۱] جاں نثار اختر شخص اور شاعر ص ۱۷ آفاق حسین صدیقی

''تمہاری محبت سے آج مجھے ڈر معلوم ہو رہا ہے تم اپنے کو مجھے
چاہنے دو۔ تمھیں چاہنے میں ہمیشہ راحت ملی ہے۔'' [۱]

صفیہ اور جاں نثار نے چار سال (۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۷ء) اس طرح کاٹے۔ کبھی جاں نثار علیگڈھ میں تو کبھی صفیہ گوالیار میں۔ کبھی کبھی چھٹیاں سراج منزل لکھنؤ میں بھی گذارتے۔ اس مدت میں اللہ نے انھیں دو بیٹے بھی عطا کیے.... عرصۂ فراق ختم نہیں ہوا تھا کہ ملک تقسیم ہوگیا۔ ملک کی اتحاد پارہ پارہ ہوگیا... ہندو مسلم ایک دوسرے کے خوں کے پیاسے ہوگئے ہندو مسلم سکھ عیسائی آپس میں بھائی بھائی ہونے کا نعرہ حرف غلط کی طرح ذہنوں سے محو ہوگیا۔ گوالیار بھی اس مسموم و جاں کا شکار ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ان دنوں جاں نثار گوالیار میں تھے.. حالات سے دب کر جاں نثار نے سب کچھ حتی کہ ملازمت کو بھی خیرآباد کہہ کر بھوپال گوشتہ عافیت کی تلاش میں پہونچے یہاں ان کی تقدیر نے یاوری کو مولانا سعید رضی صاحب وزیر تعلیمات کی نگاہ التفات جاں نثار پر پڑی انھوں نے حمیدیہ کالج بھوپال میں اردو پروفیسری کی اسامی پر انھیں فائز کروادیا........ یہاں انھیں درد فراق نے پھر کچوکے لگانے شروع کیے جاں نثار کے بار بار اصرار پر آخر کار صفیہ علیگڈھ چھوڑ کر بھوپال پہونچ گئیں اور جلدی ہی اس حمیدیہ کالج میں وہ بھی شعبۂ اردو میں لکچرار ہوگئیں۔ اس طرح زندگی کی وہ بازی ان دونوں نے آخر جیت لی جس کے لیے ہمیشہ گھٹتے رہتے تھے۔ اس سلسلے میں آفاق حسین صدیقی نے یہ الفاظ قلم بند کیے ہیں۔

''بھوپال کا یہ زمانہ جاں نثار اختر کی ازدواجی زندگی اور ذہنی

---

[۱] مکتوب صفیہ بنام جاں نثار اختر زیر لب ص ۶۰ صفیہ اختر

اطمینان کا زمانہ تھا۔ یہاں ایک طرف تو انھیں صفیہ اختر کی بھرپور
رفاقت میسر آئی دوسری طرف بھوپال کی علمی اور ادبی فضا اور خوش گوار
ماحول نے ان کے ذوق کی آسودگی کے مواقع فراہم کیے انھوں نے
درس و تدریس کے ساتھ علمی اور ادبی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لینا
شروع کیا یہاں کی ترقی پسند مصنفین کو منظم کرنے کی کوششیں کیں اور
اسے فعال بنانے میں نمایاں رول انجام دیا''۔ [۱]

بھوپال کی شب و روز جاں نثار اختر کے بڑے سکون اور اطمینا نیتِ قلب کے دن تھے گویا زندگی کی ساری خوشیاں ان کے دامن میں سمٹ آئیں ہوں لیکن اس منشائے قدرت کو کیا کہیے۔ ''ظلمتیں بھی یہاں قندیل زر کی لو کے ساتھ'' انگریز سرکار کی طرف سے کمیونسٹ پارٹی اور سرکاری ملازمین پر یہ پابندی عائد کر دی گئی کہ انجمن ترقی پسند مصنفین یا کسی ایسی ادبی انجمن سے وہ اپنا تعلق نہ رکھیں جس کے ڈانڈے کسی نہ کسی اعتبار سے ملک کی بائیں بازو کی جماعت سے ملتے ہوں جاں نثار اختر کی ادب کے حوالے سے انگریز مخالف سرگرمیوں کا شہرہ تھا۔ پرنسپل حمیدہ کالج میں ان سے جواب طلب کیا اور کہا کہ ان کو اپنے لیے ان کی مجوزہ دو باتوں میں سے ایک کو ماننا لازم ہے یا تو وہ انجمن سے لاتعلق ہو جائیں اور بدستور ملازمت کرتے رہیں یا انجمن کے رکن بنے رہیں اور ملازمت سے دست بردار ہو جائیں مسئلہ سنگین نوعیت کا تھا ایک طرف نگاہ شوق اور دوسری طرف روزی روٹی کا مسئلہ جاں نثار اختر نے مادرِ وطن کے سہاگ کی خاطر ملازمت چھوڑ دی لیکن پیٹ کی آگ کسی نہ کسی طرح تو بجھانا ہی تھا۔ ۱۹۴۹ء میں وہ نوکری چھوڑ

---

[۱] جاں نثار اختر شخص اور شاعر ص ۱۸۸ آفاق حسین صدیقی

کر بھوپال سے ممبئی فلمی دنیا میں قسمت آزمانے چلے گئے۔ اس سلسلے میں سی ایل کاوش لکھتے ہیں۔

''۱۹۴۹ء میں پھر بچھڑنا اور ملنا شروع ہوا ان دونوں کے مقدر میں سکون نہیں تھا صفیہ بے چاری تو تڑپتی رہیں۔ ایک بمبئی میں ایک بھوپال میں بیچ کا فاصلہ لمبا ہی ہوتا رہا۔'' ؎۱

ممبئی میں ابتدائی ایام میں کوئی ایسی سختی حالات نہیں تھی جو انھیں جھیلنا نہ پڑی ہو ایسی غربت اور دربدری کا تصور بھی کبھی کیا ہوگا۔ والد سشن جج تھے جاں نثار کو ان سے حسب خواہ مل ہی جاتا تھا علیگڈھ سے پڑھ کر فارغ ہوئے گوالیار میں ملازم ہو گئے۔ پھر بھوپال میں پروفیسر ہو گئے......... بے کار رہنا انھیں گوارہ نہیں تھا جتنا قلق بے مرکزیت کا تھا اتنا رنج ملازمت جانے یا جیب خرچ نہ ہونے کا نہ تھا لیکن وہ سبھی موج حوادث سے ٹکراتے ہوئے اپنی جدوجہد میں مشغول رہے۔ ان ایام میں صفیہ ان کو خطوط سے برابر ڈھارس دلاتیں اور ان کی ہمت مردانہ کو مہیز کرتی رہیں مشہور کہاوت ہے ہر بڑے آدمی کے پیچھے کسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جاں نثار اختر کو جاں نثار اختر ایک عظیم شاعر اور انسان بنانے میں صفیہ کا ہاتھ تھا وہ لکھتی ہیں۔

''شدید انتظار کے بعد تمھارا خط ملا۔ استعفیٰ آج میں پرنسپل کو نہیں پہونچا سکی۔ وہ جا چکا تھا کل لے جاؤں گی۔ تم نے استعفیٰ دے دیا اچھا کیا۔ طویل ذہنی کشمکش کا خاتمہ یوں ہی ممکن تھا۔ اگر چہ دوسری جانب

؎۱ جاں نثار اختر فن اور شخصیت جان نثار اختر نمبر ص ۹ ۷ ۳ مضموم نگار سی ایل کاوش

بھوپال کی زندگی کی سہولتیں اور کالج کی ملازمت کشش انگیز تھی۔

میری طبیعت کی کمزوری سمجھو یا کچھ بھی میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ بحر حال تم نے اپنے عزم کا ثبوت دیا اور سچ جانو میں تمھاری فوقیت کے احساس سے سر جھکا دینے پر تیار ہوں۔

''اچھے برے وقت گذر جاتے ہیں پریشانی کا مقابلہ عزم اور استقلال سے کرنا بلندی کی دلیل ہے جذباتی طور پر اپنی بے روزگار کا صدمہ دابے بیٹھنا ظاہر ہے اگر تم چاہو تو ٹھاٹھ دار ملازمت آج بھی تمھاری منتظر ہے۔'' [۱]

جاں نثار اختر فکرِ معاش میں بمبئی کی خاک چھان رہے تھے۔ صفیہ اپنے چھوٹے بیٹے سلمان اور نوکری کو گلے لگائے بھوپال میں مقیم تھیں۔ بڑا بیٹا جاوید لکھنؤ میں تھا اس کے بعد بین المشرقین کا صفیہ کی صحت پر بہت خراب اثر پڑا۔ طبیعت کا اضمحلال دھیرے دھیرے ایک طویل بیماری کا روپ اختیار کر گیا اور پھر ایک دل ہزار درد صفیہ کو طرح طرح کی بیماریوں نے آ دبوچا۔ جسکا سبب صرف دردِ فراق اور ہجرِ محبوب کہا جا سکتا ہے۔ ابتدا میں بھوپال میں علاج کرتی رہی پھر لکھنؤ آ کر حکیموں اور ڈاکٹروں سے رجوع کیا مرض بڑھتا جوں جوں دوا کی ممبئی کے ڈاکٹروں سے رجوع کیا مگر ان کا رہروِ منزل برابر منزل کی طرف بڑھتا ہی رہا صفیہ کا درد کیا تھا۔ کیا بیماری تھی۔ کوئی نبض نہ پہچان سکا لکھنؤ کے نامور ڈاکٹر بوس نے تجویز کیا۔

''صفیہ کی بیماری اعصابی ہے۔ اس کو نارمل لائف میسر آنی چاہیئے

---

[۱] صفیہ بنام جاں نثار اختر خط مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۴۹ء

یا صفیہ کو کوئی مختلف فلاسفی آف لائف اختیار کرنا چاہیئے ۔'' ڈاکٹر ٹی
بہادر'' کا کہنا تھا یہ بیماری ہے اپنا دکھ درد اپنے تک رکھنا اس سے بیماری
کی ابتدا ہوئی ہے۔'' [1]

صفیہ کی بیماری سے جاں نثار بے حد آزردہ و غمگین تھے۔ ممبئی سے لکھنؤ آئے۔ کسی طرح افاقہ نہ دیکھ کر اپنے ساتھ ممبئی لے گئے اور جے جے اسپتال میں علاج کے لیے داخل کرایا۔ کچھ افاقہ نظر آیا اور صحت کی امید بندھی۔ اپنے کو ردبصحت جان کر صفیہ پھر بھوپال لوٹ آئیں۔ یہاں آ کر پھر بیماری کا دوبارہ شدید حملہ ہوا اور صفیہ کو بغرض علاج بھوپال سے لکھنؤ لایا گیا۔ مگر کسی طرح یہاں بھی کوئی فائدہ نہ ہوسکا...اور صفیہ کی کشتی حیات منزل کو چھونے لگی۔ حالات سے جاں نثار کو آگاہ کیا گیا.........مگر ان کی تنگ دامانی ان کو وقت پر لکھنؤ پہنچانے میں مانع رہی۔ ان کی طرف سے مایوس ہو کر صفیہ نے وفات سے بیس دن قبل ۲۰ر دسمبر ۱۹۵۲ء کو آخری خط لکھا۔

''عزیز اختر میری جان''

''نظم ملی تمھارا پیارا تحفہ۔ سچ جانو میرے آنسو ہی تو چھلک پڑے آج میں کشتی مخرور ہوں اور نازاں مجھے تمھاری محبت، ملائمت، دوستی، شفقت خلوص اور اعتماد سب کچھ تو حاصل رہا ہے۔ آج مجھے ایسا محسوس ہوا میں نے تمھاری شاعری کو بھی جیت لیا ہے۔ اب مجھے اب اور کیا چاہئے۔''

اختر آؤ تم مجھے مرنے نہ دو۔ میں مرنا نہیں چاہتی۔ البتہ میں تھک بہت گئی ہوں ساتھی آؤ

---

[1] جاں نثار اختر فن اور شخصیت ص ۳۹۶

میں تمھارے زانو پر سر رکھ کر ایک طویل نیند لے لوں۔ پھر تمھارا ساتھ دینے کے لیے اٹھ کھڑی ہوں گی۔ میرے بے شمار پیار تم پر نچھاور ہوں۔''

تمھاری اپنی صفو

صفیہ کے اس خط نے جاں نثار کو تڑپا کر رکھ دیا وہ کسی نہ کسی طرح جلد از جلد لکھنؤ پہنچنے کی فکر میں خرچ کی فراہمی میں لگ گئے۔ لیکن کوئی فوری بندوبست نہ ہو سکا۔ اسی اثنا میں ان کو صفیہ کی خطرناک حالت کا تار پہنچا جاں نثار ان دنوں فلم ڈنکا کے میوزک ڈائریکٹر تھے۔ انھوں نے فلم کے مالک ایڈوانی سے پانچ سو روپئے کی حقیر سی رقم طلب کی لیکن ان حالات میں بھی ایڈوانی نے کوئی مدد کر کے جاں نثار کو فلم پروڈیوسر کے پاس بھیج دیا جس نے بقول سی ایل کاوش۔

''نمی نے کہا تین چار دن میں آپ کے روپئے مل جائیں گے اختر لکھنؤ کا تار دکھاتا ہے۔

نمی کے گھر سے پچاس روپیہ لیتا ہے اس تگ و دو میں چوبیس گھنٹے گذر گئے۔''[۱]

آخر بمشکل تمام خرچ کا انتظام کر کے جب جاں نثار ۸/جنوری ۱۹۵۳ء کو لکھنؤ پہنچے صفیہ ان کا انتظار کر کے ایک روز قبل ہی ۷/جنوری کو ابدی نیند سو چکی تھیں اور اس وقت تک عیش باغ کے قبرستان میں سپرد خاک بھی ہو چکی تھیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں۔

''ان کے انتظار میں دروازے پر ٹکٹکی لگائی ہوئی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو چکی تھیں'[۲]

---

[۱] مکتوب بنام جاں نثار اختر ۲۵/دسمبر ۱۹۵۲ء [۲] جاں نثار اختر فن اور شخصیت ص نمبر ۳۹۹

صفیہ کی موت نے جاں نثار کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ڈاکٹر خلیق انجم کا یہ تجزیہ حرف بہ حرف صحیح ہے کہ.....

''اختر صاحب کے لیے صفیہ کی موت ایک بیوی کی نہیں بلکہ ایک دوست ہمدرد اور جیون ساتھی کی موت تھی۔ سخت ترین نامساعد حالات میں بھی صفیہ کے خطوط انھیں سہارا دیتے تھے، زندگی کی تاریکیوں میں امید کی ایک ہی کرن تھی۔ وہ بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی'' [۱]

صفیہ کی موت سے متاثر ہو کر جاں نثار نے انکا مرثیہ خاکِ دل لکھا تھا۔ جو ذیل میں پیش کیا جاتا ہے مرثیہ میں جاں نثار اختر کے دل میں سلگتے ہوئے جوالہ مکھی کا دھواں اٹھتا محسوس ہوتا ہے اور ساتھ ہی صفیہ سے ان کے والہانہ عشق کی عکاسی ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

لکھنؤ میرے وطن میرے چمن زار وطن

تیرے گہوارۂ آغوش میں اے جان بہار

اپنی دنیائے حسیں دفن کیے جاتا ہوں

تو نے جس دل کو دھڑکنے کی ادا بخشی تھی

آج وہ دل بھی یہیں دفن کیے جاتا ہوں

دفن ہے دیکھ میرا عہد بہاراں تجھ میں

---

[۱] جاں نثار اختر فن اور شخصیت ص نمبر ۴۷۶

دفن ہے دیکھ میری روح گلستاں تجھ میں
میری گل پوش جواں سال امنگوں کا سہاگ
میری شاداب تمنا کے مہکتے ہوئے خواب

میری بیدار جوانی کے فروزاں مہ و سال
میری شاموں کی ملامت میری صبحوں کا جمال
میری محفل کا فسانہ میری خلوت کا فسوں
میری دیوانگی شوخ میرا ناز جنوں

ترے مرنے کا سلیقہ میرے جینے کا شعور
میرا نا موس وفا میری محبت کا غرور
میری نبضوں کا ترنم میرے نغموں کی پکار
میرے شعروں کی سجاوٹ میرے گہنوں کا نکھار
لکھنؤ اپنا جہاں سونپ چلا ہوں تجھ کو
اپنا ہر خواب جواں سونپ چلاہوں تجھ کو
اپنا سرمایۂ جاں سونپ چلا ہوں تجھ کو

لکھنؤ میرے وطن میرے چمن زار وطن

دوسرے بند کے چند اشعار دیکھئے ان میں انکے دلی محسوسات اور غم نصیب دل کے کرب کی تصویر نظر آتی ہے۔

چوم کر آج تری خاک لحد کے ذرے
ان گنت پھول محبت کے چڑھاتا جاؤں
جانے اس سمت کبھی میرا گزر ہو کہ نہ ہو
آخری بار گلے تجھ کو لگاتا جاؤں
لکھنؤ میرے وطن میرے چمن زار وطن

آخری بند سے یہ تین مصرعے ملاحظہ ہوں۔

دیکھ اس خاک کو آنکھوں میں بسا کر رکھنا
اس امانت کو کلیجے سے لگا کر رکھنا
لکھنؤ میرے وطن میرے چمن زار وطن

شخصی مرثیے کے ان اشعار سے جاں نثار کے شدید رنج والم کا اظہار اور ان کا انداز بیان کچھ اس طرح دل پر اثر کرتا ہے کہ وقتی طور سے ہم بھی خود کو ان کا شریک غم پاتے ہیں اور اس قول پر صدفی صد مہر تصدیق ثبت کرنے کو جی چاہتا ہے۔ " **افسردہ دل افسردہ**

کند انجمنے را"

صفیہ کی موت نے جاں نثار کے حوصلوں کو پست نہیں ہونے دیا بلکہ ان کو مستقبل کے لیے ایک نیا حوصلہ ملا ایک موقع پر انھوں نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''صفیہ نے زندگی بھر میری جدوجہد میں ساتھ دیا ایک سچی رفیق اور بہادر سپاہی کی طرح اور آج بھی اس کی موت نے مجھے زندگی سے بیزار نہیں کیا۔ بلکہ زندگی کی جدوجہد وقوت مجھے بخش دی ہے۔ جس منزل کا خواب ہم نے آج تک دیکھا۔ جس صبح کا انتظار ہم اب تک کرتے رہے۔ وہ منزل ضرور آئے گی۔ وہ صبح ضرور طلوع ہوگی۔ صفیہ اس صبح کو دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہ سکی لیکن مجھے یقین ہے جب وہ صبح طلوع ہوگی صفیہ اس میں ضرور مسکرائے گی۔''[۱]

صفیہ کی قبر سے رخصت ہوکر جاں نثار اختر نے اپنے دونوں بیٹوں سلمان اور جاوید کے ننھیال سراج منزل لکھنؤ میں چھوڑ کر دوبارہ ممبئی کا رخ کیا۔ اور جہد حیات میں مشغول ہوگئے۔ رفتہ رفتہ ان کے لیے راہیں ہموار ہونے لگیں مشاعروں میں شرکت کی غرض سے اکثر ان کا آنا بھوپال بھی رہتا۔ ایک دفعہ جب وہ بھوپال سے لکھنؤ آئے یہاں ان کی ملاقات ایک شریف خاتون خدیجہ ہارون سے ہوئی۔ یہ ستم دیدہ خاتون پہلے کرکٹ کے مشہور کھلاڑی شمس اللطیف سے پہلی بار شادی ہوئی تھی جن سے ان کا ایک بیٹا شاہد بھی تھا۔ لطیف بغیر کہے یا بتلائے خدیجہ کو چھوڑ کر پاکستان جا بسے۔ اس غیر ذمہ دارانہ روش کا خدیجہ پر گہرا اثر ہوا تھا

---

[۱] اداریہ حمیدہ کالج میگزین ۱۹۰۰ ص ۲

جو جو وقت گذرتا گیا۔ محبتیں نفرتوں میں بدلنے لگیں..کافی عرصے کے بعد لطیف ہندوستان آئے اور بہلا پھسلا کر خدیجہ کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے کوششیں کیں۔مگر خدیجہ نے ان کی بے راہ روی کے پیش نظر ان کے ساتھ جانے سے صرف انکار ہی نہیں کیا بلکہ عدالت کے ذریعہ لطیف سے طلاق حاصل کر لی۔ خدیجہ کو شعر وادب سے کافی لگاؤ تھا اور وہ جاں نثار کے کلام کی شیدائی بھی تھیں۔ رفتہ رفتہ دونوں کی یہ ملاقات قربتوں کا باعث بھی بننے لگی۔خدیجہ جاں نثار کی دلجوئی کرتیں اور جاں نثار بھی ان کا دم بھرنے لگے آخر کار ۷/دسمبر ۱۹۵۶ء کو دونوں نے عقد کرلیا اور ازدواجی زندگی بسر کرنے لگے خدیجہ کے نسبی حالات اور خاندانی وقار پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر عبدالقادر لکھتے ہیں۔

> ''شیخ حسین بن انصاری یمن سے ہندوستان (بھوپال) آئے۔ ان کی پہلی آمد سکندر بیگم کے عہد میں ۱۸۶۲ء میں ہوئی دو سال بھوپال میں قیام کرنے کے بعد پھر یمن واپس چلے گئے دوبارہ ۱۸۶۶ء شاہجہاں کے عہد میں تشریف لائے اور پھر کچھ عرصے کے بعد چلے گئے۔ جہاز کے سفر میں نواب صدیق حسن خاں کی ملاقات شیخ حسین سے ہوئی۔نواب صاحب شیخ حسین کے غیر معمولی حافظے علوم حدیث پر ان کی غیر معمولی قدرت اور ان کا شجرۂ علمی دیکھ کر ایسا گرویدہ ہوئے کہ خود ان سے سند بھی لی اور ان کو بھوپال آنے کی دعوت بھی دی ۱۸۷۹ء میں وہ بھوپال آئے اور مستقل سکونت اختیار کرلی۔ شیخ عبداللہ شیخ حسین کے صاحبزادے تھے اور یمن سے اپنے

والد بزرگوار کے ساتھ آئے شیخ عبداللہ خود بھی عظیم المرتبت عالم تھے وہ
ناظم ندوۃ العلماء بھی رہے۔ علیگڈھ اور لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی زبان
وادب کے استاد رہے۔ شیخ عبداللہ کے بڑے بھائی شیخ محمد بن حسین
تھے جو طبعی ذوق ادب وشاعری کا رکھتے تھے عرصہ تک دارالعلوم ندوۃ
العلماء میں عربی کے استاد رہے۔ شیخ محمد بن حسین کے صاحبزادوں
میں شیخ خلیل الرحمان عبدالرحمٰن، حبیب الرحمٰن،'' عبید العرب سابق
پروفیسر صدر شعبہ عربی حمیدیہ کالج بھوپال تھے''۔ شیخ عبداللہ کے دو
صاحبزادے تھے ہارون عرب اور مامون عرب، خدیجہ طلعت شیخ
ہارون عرب کی صاحبزادی تھیں اور ننھیال کی طرف سے خدیجہ جاں
نثار اختر کی والدہ سید علی بلگرامی کی نواسی اور سید حامد حسین بلگرامی کی
صاحبزادی تھیں۔'' [1]

یہی خدیجہ طلعت جاں نثار کی تاریک اور منتشر زندگی میں ماہ منور کی طرح ضوفشاں ہوئیں تو جاں نثار کی سرگردانی اور تفکرات سے پُر زندگی میں ٹھہراؤ کے آثار نمودار ہونا شروع ہوئے۔ خدیجہ جاں نثار کے ساتھ ممبئی میں رہتی تھیں۔ جاں نثار کو قدرے سکون تھا۔ ان کے گیت فلموں میں مقبول اور ہٹ ہونے لگے تھے جاں نثار اس شادی سے خوش تھے۔ اسی زمانے میں کہی گئی ایک نظم کے یہ دو اشعار ملاحظہ ہوں ان میں ان کی مسرتوں اور قلب مطمئنہ کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ ؎

---

[1] شاعر جلد ۴۷ شمارہ ۱ ص ۲۸

ایک طغیان طرب ہے میرے کاشانے میں
اک غم آہی گیا دل کے صنم خانے میں
شہر میں ایک قیامت تیرے اقدام سے ہے
آج کی رات تو منسوب ترے نام سے ہے

صفیہ کے بطن سے جاں نثار کے دو بیٹے جاوید اختر اور سلمان ہوئے۔ جاوید اختر آج ایک مشہور فلمی ادیب اور شاعر ہیں انھوں نے سلیم کی ساتھ کئی فلموں کی کہانیاں اور مکالمے بھی لکھے جن کو باکس آفس پر سوپر ہٹ ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ جاوید کا پیار کا نام جادو تھا۔ ابتدا ہی سے وہ نہایت ذہین اور شعروادب کے رسیا تھے صفیہ اپنا ایک خط جاوید کے سلسلے میں لکھتی ہیں۔

''جاوید کے دو خط تمہارے نام آئے۔ بھیج رہی ہوں۔ اس کی پیدائش میں مجھے چند دنوں کی بات معلوم ہوتی ہے اور وہ اب خط بھی لکھنے لگا ہے۔ مجھے بڑی فاتحانہ مسرت ہوئی ہے، اس کی ذہانت اور اس کے دماغ کو دیکھ کر میں نے تمہارا بہترین عنصر نچوڑ کر اپنا لیا ہے۔ لیکن تم نے کچھ کھویا نہیں بلکہ پایا ہے۔ اس کا دوسرا خط پڑھنے میں شاید تمھیں دقت ہوگی لکھتا ہے۔

''ابو وہ شیر (شعر) جو آپ نے لکھا ہے'' ''اے دل مجھے ایسی جگہ لے چل جہاں کوئی نہ ہو۔'' غلط ہے اس کو گمان ہے یہ مصرعہ تمہارا ہے اور اسکی تنقید کی ہے اس سے ظاہر ہے وہ تم جیسے انسانی انقلاب پسندوں سے آگے ہوگا۔ وہ فرار کا قائل نہیں۔ تم گھبرا جاتے ہو اور شکست محسوس

کرنے لگتے ہو وہ ڈٹ کر پڑھے گا اور تم سے آگے نکل جائے گا۔ آؤ دونوں ملکر اسے پیار کریں اور اپنے جذبات کے دھاروں کا اک سنگم تلاش کریں۔"

صفیہ کی یہ پیشن گوئی سچ ثابت ہوئی۔ جاوید اختر آج فلمی دنیا کا نہایت مقبول اور کامیاب کہانی نویس اور گیت کار ہیں۔ جاوید کے چھوٹے بھائی اور جاں نثار کے پسر ثانی کا نام سلمان تھا۔ گھر میں اسے اویس کہا جاتا تھا۔ اویس بھی جاوید کی طرح ذہین اور شوخ چنچل تھا۔ دونوں بیٹوں کی معصوم شرارتوں کا ذکر صفیہ اپنے ایک دوسرے مکتوب میں جاں نثار کو لکھتی ہیں۔

"کل خط لکھ چکی ہوں غالباً شام ہی کو پوسٹ ہوا ہے۔ پھر اتوار آجائے گا اور میں تم سے باتیں نہ کرسکوں گی اس لیے پھر آج لکھ رہی ہوں یہ کم بخت بچے اس تحریری ملاقات میں مخل ہوتے ہیں۔ اویس (سلمان) برابر کاغذ کا مطالبہ پیش کر رہا ہے اور خط لکھنے نہیں دیتا۔ جادو (جاوید) کو پرسوں رضیہ بھابھی آکر اپنے ہمراہ لے گئیں وہ جہاں گیر پیلس میں ٹھہری ہیں۔ جادو کو راج محل اس قدر پسند آیا کہ وہ واپسی کا نام نہیں لیتا میں شام کو لے کر گئی مگر واپس نہیں آئے۔"

عہد طفولیت سے ہی سلمان کو قلم کاغذ سے بہت لگاؤ تھا۔ آگے چل کر وہ ڈاکٹر ہو گئے آج کل امیریکہ میں رہتے ہیں۔

زوجۂ ثانی (خدیجہ) کے شوہر اولیٰ (کرکٹ کھلاڑی مسٹر لطیف) سے ایک بیٹا شاہد تھا جس کو جاں نثار سے عقد کے بعد خدیجہ اپنے ساتھ لائی تھیں جاں نثار نے اس کے ساتھ بھی سگے بیٹوں کی سی محبت اور سرپرستی کا سلوک کیا۔ اسکے نام کے ساتھ اپنے نام کو جوڑ دیا تھا۔ شاہد + اختر = شاہد اختر، اور خدیجہ کے بطن سے جاں نثار کی دو بیٹیاں عزیزہ اور صوفیہ ہوئیں۔ جنکی عرفیت علی

الترتیب نُنھی اور فیضی تھی۔ جاں نثار اپنی بڑی بیٹی عزیزہ کو بہت زیادہ چاہتے تھے۔ انھوں نے اس کے نام ایک نظم ''آخری لمحہ'' لکھی تھی اس کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں یہ نظم کیا ہے ایک وصیت نامہ ہے ملاحظہ ہو۔

تم میری زندگی میں آئی ہو
میرا اک پاؤں جب رکاب میں ہے
دل کی دھڑکن ہے ڈوبنے کے قریب
سانس ہر لحظہ پیچ و تاب میں ہے
ٹوٹتے بے خروش تاروں کی
آخری کپکپی رباب میں ہے
کوئی منزل نہ جادۂ منزل
راستہ گم کسی سراب میں ہے
تم کو چاہا کیا خیالوں میں
تم میری زندگی میں آئی ہو
میرا اک پاؤں جب رکاب میں ہے

اس نظم کے چند آخری اشعار ملاحظہ کیجئے۔ ان میں ان کے اپنے خیالاتی وقار کا احساس اور ان کی اپنی نظر میں ناکامیاب زندگی کی کسک اور رقصِ حیات کو نظر آتی منزل کا منظر نامہ ہے

مخاطب ان کی بیٹی عزیزہ ہے۔

تم ایک ایسے گھرانے کی لاج ہو جس نے
ہر ایک دور کی تہذیب و آگہی دی ہے
تمام منطق وحکمت تمام علم و ادب
چراغ بن کے زمانے کو روشنی دی ہے
جلا وطن ہوئے آزادیٔ وطن کے لیے
مرے تو ایسے کہ اوروں کو زندگی دی ہے

غم حیات سے لڑتے گذار دی میں نے
مگر یہ غم ہے تمھیں کچھ خوشی نہ دے پایا
وہ پیار جس سے لڑکپن کے دن مہک اٹھیں

وہ پیار بھی میں تمھیں دو گھڑی دے نہ پایا
میں جانتا ہوں کہ حالات سازگار نہ تھے
مگر میں خود کو تسلی کبھی نہ دے پایا

آؤ آنکھوں میں ڈال دو آنکھیں

روح ادب نزع کے عذاب میں ہے
تھر تھر اتا ہوا تمھارا عکس
کب سے اس دیدۂ پُر آب میں ہے

آؤ اس چاند سے ماتھے کو ذرا چوم تو لوں
پھر نہ ہوگا تمھیں یہ پیار نصیب آجاؤ
آخری لمحہ ہے سینے پر مرے سر رکھ دو
دل کی حالت ہوئی جاتی ہے عجیب آجاؤ
نہ اعزانہ احبانہ خدا سے نہ رسول
کوئی اس وقت نہیں میرے قریب آجاؤ
تم تو قریب آجاؤ

ان چیدہ چیدہ اشعار سے ان کے فرط جذبات کے اندازے کے ساتھ ان کے عقائد و تصورات کا بھی علم اور انکی بیٹی سے بے پناہ محبت و پیار لگاؤ کے باوجود اس کے لیے کچھ نہ کر سکنے کا قلق اور بہت کچھ کرنے حوصلہ جھلکتا ہے۔

اخلاق و عادات:

جاں نثار اختر مزاجاً خوش اخلاقی باوضع۔ متین و سنجیدہ پر عزم اور با حوصلہ ہمت مردانہ سے محنت اور کام سے نہ تھکنے والے گہری اور پر خلوص انسانی ہمدردی، دردمندی اور جاں نثاری

جاں نثار کا خاصۂ فطری تھا۔ قناعت وصبر، خود اعتمادی اور نازک مزاجی ان کا جوہر خاص، حلیم الطبع اور سلیم الطبع، تعلقات میں رکھ رکھاؤ، چھوٹوں کا لحاظ اور بزرگوں کا ادب واحترام سادگی لباس لب ولہجہ میں نرمی شگفتگی اور گھلاوٹ، غم وحسرت دونوں سے برابر کے متاثر لیکن اکثر معمولی سی خلافِ وضع بات پر جھنجلانا یا مشتمل ہو جانا ان کی شخصیت کے جز ولاینفک تھے۔ اس ضمن میں داخلی شہادتوں سے کوئی نتیجہ اخذ کرنا راقم کے خیال سے نہایت مفید، معتبر اور درست ہوگا چنانچہ سب سے پہلے ان کی شریک حیات صفیہ اختر کی زبانی سنیئے جو کچھ انھوں نے اپنے ایک مضمون میں قلم بند کیا ہے۔

''اختر کے مرنجاں مرنج اور دوسروں کی ہر بات پر مستقل جنبش سر وہ بھی نیچی اور میٹھی مسکراہٹ ان کے احباب پر ان کی نیک مزاجی کا نقش قایم کیے ہوئے۔ لیکن شاید ہی آپ اس صداقت پر اعتماد کریں کہ اختر کی نازک مزاجی کو گوارا بنانے کے لیے گاندھی جی کی طرح انتہائی قلب وجگر کی ضرورت ہے۔ خواہ اپنا دل شیشہ سے نازک کیوں نہ ہو لیکن ہر نئے دوست کے نازک تر ہونے کا سوال ہے۔ اس لیے اگر اس بلائے جان سے نبھائے رکھتی ہے۔ تو کسی موقع پر لہجہ میں یا گفتگو میں تندی پیدا نہ ہونے دیجئے ورنہ معاملات تخریب کی حد تک ایک جست میں پہونچ سکتے ہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ فطرت نے معاوضہ کے طور پر ان میں بچوں کی سی معصوم مسرت کی صلاحیت بھی رکھ دی ہے۔ جس سے شاید وہ کبھی زندگی بھر محروم نہ ہو سکیں گے۔ اگر ان کی

طبیعت میں چڑھ نہ پیدا کی جائے تو وہ خود اپنی طرف شورش نہ پیدا
کریں گے اور دل آزادی کا باعث نہ بنیں گے ایک شاعر ہونے کی
حیثیت سے ان کا شدید طریقہ پر حساس ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں
ہے غصہ وغم کیف ومسرت دونوں حالتوں سے برابر متاثر رہنے کی
صلاحیت ان بدرجہ شدید ہے اس طرح محبت اور نفرت دونوں میں
شدت پسندی سے بری نہیں۔ ان کے ضمیر میں جذبات کا عنصر زیادہ
ہے اس لیے وہ معاملات پر تنقیدی نظر رکھنے سے اکثر قاصر رہتے ہیں۔
اختر کی نازک مزاجی کی مثالیں ان کی روز مرہ کی زندگی سے سنئے
۔ پلنگ کا ٹیڑھا ہو جانا دماغ میں انتشار پیدا کرنے کے لیے کافی ہے۔
بستر کی چادر کا کونہ لٹک جانا اور قدرا اہم اور سنجیدہ ہے جتنا کی مشرقی اور
پنجاب کی مقررہ حدود میں ذرا سا ترچھا پن پیدا ہو جانا۔ ان کی یہ نازک
مزاجی اور نفاست پسندی ان کی مجموعی لا پرواہی سے ہم آہنگ نظر نہیں
آتی۔'' [۱]

اس مضمون میں صفیہ اختر آگے لکھتی ہیں۔

''البتہ اس سلسلے میں ایک کمی جو میں پاتی ہوں وہ یہ کہ ان میں ذاتی معاملات کے
بارے میں تفریحی شعور بیدار رکھنے کی صلاحیت نہیں ....اختر غم دوراں میں ہوں یا غم جاناں
دونوں حالتوں میں اٹکھیلیوں سے بے زار ہی نظر آئیں گے انھیں سپردگی میں لذت حاصل

---

[۱] انداز نظر ص ۸۵ مضمون گھر کا بھیدی از صفیہ اختر ۱۹۴۸ء

ہے۔

مزاجی کیفیت کے علاوہ جہاں تک اختر کی فطرت کا تعلق ہے کسی ....کی فطرت سے کم دلچسپ نہیں۔ جیسا کہ عرض کر چکی ہوں کافی روشن دماغ اور غیر معمولی ذہانت رکھنے کے باوجود اپنے ذہن کی کارفرمائیوں کو اپنے جذباتی ردعمل پر حاوی کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے......... کسی فنکار کو لیجئے اس کی خود پسندی خود پرستی پر آپ کو حیرت نہ ہوگی۔ اس خود پرستی کا اظہار اختر کے یہاں گھر کے محدود دائرے میں بڑی شد و مد کے ساتھ ہوتا ہے۔

غالباً اس خود پرستی کا نتیجہ ان کا ذوق تحکم ہے۔ جس سے جتنا زیادہ قریب ہوں گے اس قدر اس پر اپنے تحکم کا نقش دیکھنا چاہیں گے.........ان کے ذوق ملکیت اور جذبۂ تحکم کے علاوہ ان میں ایک دل چسپ خصوصیت میں نے ان میں دریافت کی ہے وہ یہ کہ محبت اور خیال کے بارے میں وہ ضبط کے قایل ہیں جس کا انھیں جتنا خیال ہوگا اتنی ہی کڑی نظر رکھیں گے اور اظہار سے بچیں گے........ احباب کے معاملے میں اختر کی طبیعت خاصی دیر آشنا ہے۔ خود کبھی پیش قدمی کر کے کسی سے ملنے کے عادی نہیں نہ تیزی سے ربط ضبط بڑھانے کے قایل البتہ ہم مذاق اور ہم مسلک دوستوں سے ان کی وفاداریاں استوار ہیں۔ ان کے تذکروں سے اکثر تنہائی کے لمحوں میں گرمی اور روشنی پیدا کرنا اختر کا محبوب مشغلہ ہے۔ بے تکلف دوستوں کی محفل میں اختر کی کم گوئی کے بند ٹوٹ جاتے ہیں اور وہ گفتگو میں خاصی مستعدی اور گرما گرمی سے شریک نظر آتے ہیں۔'' [۱]

جاں نثار کی حد درجہ حساس فطرت اور سریع الرنج فطرت پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے

....

[۱] انداز نظر ص ۸۵۔۸۶ مضمون گھر کا بھیدی از صفیہ اختر ۱۹۴۸ء

مخلص دوست فاطمہ زبیر رقم طراز ہیں۔

''انھیں ہر وقت بہلائے اور خوش رکھنے کی ضرورت رہتی تھی۔ انکی باتوں نے انھیں بے حد نازک مزاج بنا دیا تھا۔ بعض اوقات ذرا سی بات پر روٹھ جاتے تھے۔''[۱]

جاں نثار اختر کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر ڈاکٹر خلیق انجم نے نہایت گراں قدر روشنی ڈالی ہے لکھتے ہیں۔

''میانہ قد گندمی رنگ کشادہ پیشانی خمار آلود پلکیں سلگتی ہوئی اور چمکدار آنکھیں ستوان اور لمبی ناک پتلے پتلے ہونٹ نکلتی ہوئی ٹھڈی۔ کنگھے کی آرائش سے بے نیاز کانوں پر بکھرے ہوئے لمبے لمبے بال نگاہوں میں دردمندی ہونٹوں پر مسکراہٹ چہرے پر معصومیت اور بھولا پن مزاج میں سادگی طبیعت میں نزاکت نفاست فطرت میں قلندری عادتوں میں لاپرواہی باتوں میں بے تکلفی گفتگو میں شگفتگی انداز بیان میں شائستگی آواز میں نرمی لب ولہجہ میں گھلاوٹ اور لوچ بات چیت کے دوران میں بار بار انگلیوں سے زلفوں کو سنوارنے کی خاص ادا چال ڈھال میں بے پرواہی اور بے نیازی لباس میں قناعت پسندی کرتا اور چوڑی مہری کا سفید پاجامہ کبھی کبھی ٹینوں کی نہرو کٹ واسکٹ پاؤں میں چپل تعلقات میں رکھ رکھاؤ اور میانہ روی اور میانہ روی بڑوں کے

۱؎ حرف آشنا ص ۹

ساتھ عزت واحترام کا رویہ ہم عصروں کے ساتھ بے تکلفی اور خوش
مذاقی چھوٹوں کے ساتھ شفقت محبت ایک شفیق بزرگ مخلص دوست
ہمدرد ساتھی شگفتہ طبیعت بامروت اور ملنسار انسان یہ تھے جاں نثار اختر
۔'' [۱]

جاں نثار کی شخصیت کی گونا گوں صفات اوران کی دلچسپ شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا ذکر ڈاکٹر خلیق انجم یوں کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریر سے جاں نثار کے دیرینہ روابط کا بھی پتہ چلتا ہے۔

''اختر صاحب سے میری پہلی ملاقات تیرہ چودہ سال پہلے دہلی
کے ایک مشاعرے میں ہوئی تھی اوپر سے نیچے تک شاعر چوڑی موہری
کا پاجامہ سفید شیروانی جس کے سارے بٹن کھلے ہوئے بکھرے ہوئے
بال جنھیں وہ بار بار سنواتے رہتے تھے۔ سوئی سوئی آنکھیں چہرے پر
مہاتماؤں والا سکون بچوں والی معصومیت مشاعرے اوراس کے ماحول
سے بالکل بے نیاز سگریٹ پر سگریٹ سلگائے جارہے تھے۔ تیرہ چودہ
برس پہلے کے اور آج کے اختر میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی ہاں ان
کے قہقہوں کا کھوکھلا پن ضرور ختم ہوگیا ہے۔ اب یہ زیادہ جاندار اور
سچے لگتے ہیں ہر بات کے جواب میں ان کے ہونٹوں پر کھلنے والی شرمیلی
سی مسکراہٹ اور زیادہ حسین اور زیادہ دلنواز ہوگئی ہے۔ اب ان کے

---

[۱] جاں نثار اختر شخص اور شاعر ص ۹ آفاق حسین صدیقی

قہقہوں اور مسکراہٹوں میں خود اعتمادی کی جھلک زیادہ نمایاں ہو گئی ہے
اب ان کا شگفتہ چہرہ دیکھ کر یقین کرنا مشکل ہوتا ہے کہ یہ وہ شخص ہے
جسکی زندگی کا بڑا حصہ پتھروں سے سر ٹکرانے میں گذرا ہے۔'' ۱؎

جاں نثار اختر کے ہم زلف جہاں قدر چغتائی اپنے ایک مضمون میں جاں نثار اختر کے لباس کا بھی ذکر کیا ہے جاں نثار کو وطن کی ہر چیز سے محبت تھی۔ چنانچہ لباس کے معاملے میں بھی وہ غیر ملکی لباس کوٹ پتلون کے مقابلے میں ویسی لباس کرُتا پائجامہ کبھی کبھی واسکاٹ کو روار کھتے تھے۔ جہاں قدر چغتائی لکھتے ہیں۔

''اب کرتا پائجامہ اور چپل لباس ٹھہرا ہے۔ جب اہتمام سے
کپڑے سے پہننا چاہتے ہیں تو ایک واسکٹ کا اضافہ کر لیتے ہیں۔
ایک بار میں نے کوٹ پتلون پہنے کا مشورہ دیا تو جواب میں ملا میں نہیں
چاہتا کہ میرے معاملے میں سوانح نگار یہ جملہ لکھے'' مرحوم آخر وقت
میں سوٹ پہننے لگے تھے۔'' ۲؎

شخصیت:۔

جاں نثار اختر نہایت متین اور سنجیدہ شخصیت کے مالک تھے لیکن اس سنجیدگی میں ان کی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی لطیف قسم کی ظرافت کا بھی اچھا خاصا دخل تھا۔ اکثر اپنے بے تکلف دوستوں سے گفتگو کرتے ہوئے اپنے حسین مزاج اور پر لطف لطائف سے بات چیت کو دلچسپ بنا دیتے تھے۔ ان کے لطائف قہقہوں کو دعوت نہ دیکر صرف کلیوں کی مسکان بھر کر مخاطب کو دیر

۱؎ بے وقت کا آدمی فن اور شخصیت جاں نثار اختر از ڈاکٹر خلیق انجم ص ۴۷۶

۲؎ جاں نثار اختر فن اور شخصیت نمبر جہاں قدر چغتائی ص ۴۶۵

تک رہ رہ کر مسکرانے کا سامان پیدا کرتے تھے احسان الحق صاحب جاں نثار کے بے تکلف دوستوں میں تھے۔ دہلی کے ایک ہوٹل میں اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

''جاں نثار اختر کہنے لگے بھئی کاتب ہمارے ادب کا ایک بہت بڑا جزو ہے۔ مولانا آزاد غبار خاطر کے کاتب کو ہوائی جہاز سے بلوایا کرتے تھے۔ خود ہم لوگ اچھے کاتب کی خوشامد کرتے پھرتے ہیں۔ باقر مہدی کی کتاب '' آگہی و بے باکی'' کے جب پروف پڑھے جارہے تھے تو ایک مضمون کے حاشیے میں لکھا تھا '' کاتب کا مصنف سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔'' [۱]

اپنے بے تکلف دوستوں سے وہ ہر طرح کی بات چیت کرتے تھے۔ ان کو اردو فارسی اساتذہ کی صدہا اشعار از بر تھے۔ اور غیر موضوع یا بھکڑ قسم کے اشعار کا بھی ان کے پاس وغیرہ تھا۔ اکثر دیکھنے میں آیا کہ وہ اپنی ظرافت طبع اور انھیں مہمل اشعار سے محفل کو قہقہہ بار بنا دیتے تھے احسان الحق صاحب کے یہ تاثرات جاں نثار اختر کی شخصیت کے کچھ اور پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں ملاحظہ کیجئے۔

''اردو شاعری کے گھٹیا اور مہمل شعروں کی یادداشت کے سلسلے میں اختر بھائی مشہور ہیں ایک دفعہ غالباً سردار جعفری، ساحر، اور تاج ان کے ساتھ تھے۔ سردار نے بیت بازی شروع کرادی لیکن طے ہوا کہ اچھا اور بامطلب شعر کوئی نہیں پڑھے گا۔ اگر کسی شعر کا کوئی معقول مطلب نکلے گا تو پڑھنے

---

[۱] ٹوٹے پھوٹے شعر جڑوالو احسان الحق جاں نثار اختر فن اور شخصیت نمبر ص ۴۶۸

والے کے نمبر کٹ جائیں گے۔ سردار نے خود شرکت کرنے سے انکار کر کے جج کی کرسی سنبھال لی ساحؔر اور تاؔج ایک طرف ہو گئے۔ بیت بازی تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے تک جاری رہی اردو شاعری کے جتنے مہمل شعر ہو سکتے تھے ان تینوں نے مل کر دہرا ڈالے۔ اختر بھائی جانے کہاں سے شعر نکال کر لائے اور وہ حاصل مشاعرہ ثابت ہوا۔

یہ دعا کر کہ میرے دل کو قرار آ جائے
کہیں لڑ کر نہ تیرے گھر میں مزار آ جائے[1]

سب سے بڑا وصف ان کا یہ تھا کہ نوجوان نسل کے شعرا پر ان کی خاص نگاہ تھی۔ عام شعرا یا ادیبوں کی طرح وہ ان پر انی فوقیت کا بوجھ نہیں ڈالتے اور نہ مرعوب کرنے ادنیٰ سی کوشش کرتے بر خلاف اس کے ان کی پوری طرح حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ان کا سلوک ایسے مبتدیوں کے ساتھ مشفقانہ اور دوستانہ ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کا تجزیہ ہے۔

''اختر صاحب سقراط بقراط بن کر کم عمر ادیبوں اور شاعروں پر دھونس نہیں جماتے بلکہ انھیں کی سطح پر اتر کر گفتگو کرتے ہیں وہ خود سے بڑا تو شاید کچھ لوگوں کا مانتے ہوں لیکن خود سے چھوٹا کسی کو نہیں مانتے

---

[1] ٹوٹے پھوٹے شعر جڑ والو احسان الحق جاں نثار اختر فن اور شخصیت نمبر ص ۴۶۸

تھے۔ نئے اور ابھرتے فنکاروں کی ہر ممکن حوصلہ افزائی کرتے ہیں
لیکن ایک بزرگ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ساتھی اور دوست کی
حیثیت سے''۔ [۱]

ممبئی جیسے مصروف ترین شہر میں جہاں آدمی لمحوں کا حساب رکھ کر زندگی گذارتا ہے یہاں بھی جاں نثار اختر اپنے دوستوں اور ادبی محفلوں کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے تھے بلکہ ہر روز کئی کئی گھنٹے اپنے دوستوں میں بیٹھ کر گذار دیتے تھے۔ وقت کا تعین کسی ملاقات کے لیے ضروری نہیں تھا۔ یہ الفاظ ڈاکٹر خلیق انجم۔

''سورج ڈھلنے پر آپ بے تکلف ان کے گھر جا سکتے ہیں۔ ایک
درد مند دل ملے گا۔ محبت ملے گی خلوص ملے گا پینے کو شراب ملے گی۔
سننے کو نوجوان ادیبوں اور شاعروں کو ادبی موضوعات پر گفتگو ملے گی۔
دس اور گیارہ کے درمیان کھانا ملے گا۔ اختر صاحب کے گھر میں
ہونے والی ان ادبی صحبتوں کی حیثیت جلتے ہوئے ریگستان میں نخلستان
کی ہے جہاں مسافر کچھ دیر کے لیے تازہ دم ہو جاتے ہیں۔'' [۲]

شعر گوئی اور مطالعہ کا شوق:۔

جاں نثار کے شعر کہنے کا طریقہ دوسرے شعرا کے بالکل برعکس تھا عام طور سے شعراء ایک ہو کر یا تنہائی میں مشق سخن لیکن وہ ہمیشہ انجمن پسند رہے اس لیے عموماً بیوی بچوں کے بیچ بیٹھ کر شعر کہنے سے خوگر تھے۔ صفیہ نے جاں نثار اختر کے لمحات زندگی جو بھی ان کے ساتھ گذارے ان کا

---

[۱] [۲] بے وقت کا آدمی ڈاکٹر خلیق انجم جاں نثار اختر فن اور شخصیت نمبر ص ۴۷۵

پل پل کا حساب رکھتی تھیں۔ چنانچہ ان کی شعر گوئی یا شوق مطالعہ یا کتب بینی کا انھوں نے کھل کر ذکر کیا ہے۔ صفیہ کے مقابلے میں باہری روایت اتنی دقیع نہیں ہو سکتی اس لیے صفیہ کی تحریر من وعن اس جگہ پیش کی جاتی ہے۔ جو اس سلسلے میں بڑی وافر معتبر معلومات کا سرچشمہ کہی جا سکتی ہے۔ ملاحظہ ہوں۔

''اُن کی حسن پرستی کے ساتھ ہی ان کی شعر گوئی کا تذکرہ ضروری ہے میں نے شادی سے پہلے اپنے گھر میں اپنے بھائی مجاز کو شعر کہتے ضرور دیکھا تھا لیکن ان کا انداز اس سلسلے میں بالکل مختلف ہے اسرار بھائی مجاز ہمیشہ تنہائی میں شعر کہتے ہیں اور بڑی رازداری کے ساتھ کیا مجال کس کی نظر بھی اس وقت پڑ سکے جب تک وہ مکمل نہ ہو جائے اختر ہم لوگوں کے بیچ میں بیٹھ کر شعر کہتے ہیں۔ اکثر خود لکھنے کی زحمت سے بچتے ہیں اور یہ فرض فاطمہ بہن کے سپرد ہوتا ہے کہ وہ لکھتی جائیں۔ فاطمہ کی ہستی ادبی حلقے میں اس حد تک متعارف ہے جتنا کہ اختر کا کلام اختر کے پچھلے مجموعہ کلام ''سلاسل'' اک انتخاب فاطمہ بہن کے نام از رموز فطرت سن حرم مے کے عنوان کے ساتھ شامل ہے۔ جاں نثار اختر کی سرکشی اگر کسی کے سامنے شکست آشنا ہوئی ہے تو وہ فاطمہ بہن کی ذات ہے شعر کہنے کی دوران میں داد بھی چاہتے جائیں اکثر اصلاحات بھی قبول کر لیں گے شعر بہت تیزی سے کہتے ہیں اور اکثر طویل نظمیں دو ڈھائی گھنٹے میں مکمل کر لیتے ہیں نظم ختم ہوتے ہی رد عمل شروع ہوتا

ہے۔ ''کیا فضول بکا ہے ہٹاؤ پھینکو''۔ ۱؎

اس سلسلے میں صفیہ اختر آگے لکھتی ہیں۔

''لکھنے پڑھنے کے لیے ان کو سکون کے علاوہ کوئی اور لوازمات درکار نہیں.....مطالعہ کے سلسلے میں میں نے ان کا کوئی محدود یا مخصوص مذاق نہیں پایا اختر طب فلسفہ تصوف دیوان غالب اور دوسرے قلمکاروں کی کتابیں ایک ہی انہماک اور مصروفیات کے ساتھ پڑھتے پائے جائیں گے بے کیفی کے لمحات کاٹنے کا طریقہ ان کے یہاں یہی ہوتا ہے کہ جو پہلی کتاب ہاتھ لگے لے کر بیٹھ گئے اور اس توجہ اور سرگرمی کے ساتھ اس کا مطالعہ شروع کیا کہ گویا کل ہی اس کی تردید میں کتاب لکھنا پڑے گی۔ اس قسم کے مطالعے گھر پر اپنا اقتدار قایم رکھنے کے لیے بھی اکثر استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً کھانا لگ گیا ہے کتاب کے کسی باب میں آٹھ صفحے باقی ہیں اب کھانا مٹی ہو جائے مگر اختر اسے ختم کرنے سے پیشتر نہیں اٹھیں گے''۔ ۲؎

جاں نثار کا مطالعہ وسیع تھا وہ سبھی موضوعات سے یکساں طور پر دلچسپی رکھتے تھے ان کے لیے مطالعہ ان کی ذہنی مسرت اور انبساط کا باعث ہوتا تھا۔ مطالعہ سے وہ زحمت محسوس کرتے اور محسوس یہ ہوتا تھا کہ دماغ کی تھکن دور کرتے تھے۔

''عام مردوں کے برخلاف کھانے کا کوئی خاص شوق نہیں تھا۔ کم

....

۱؎ ۲؎ انداز نظر (گھر کا بھیدی) صفیہ اختر ص ۹۰-۹۱

خوراک تھی اور میٹھی چیز سب سے زیادہ پسند تھی بیماری میں جلدی گھبرا
جاتے تھے۔لیکن لطف یہ کہ دوا اور پرہیز سے بھی جی چراتے تھے۔ایک
موقع پر صفیہ اختر نے لکھا ہے۔ میں نے اپنے گھر میں مردوں کو بیمار
ہوکر اس طرح صبر کھاتے نہیں دیکھا تھا۔اختر کی انگلی میں پھانس لگ
جانا بھی کسی تیز تیز نیم کش کی خلش سے کم نہیں جو جگر کے پار نہ ہوا ہو۔
حرارت کے سو درجہ تک پہنچتے ہی تقریر شروع ہو جاتی اور لہجہ پر حد درجہ کا
سوز و گداز طاری ہو جاتا ہے۔'' [۱]

عقاید:۔

جاں نثار کی پرورش پرداخت ایک دیندار مذہبی گھرانے میں ہوئی تھی۔ وہ مذہب کی افادیت اور ہمگیری سے ہمیشہ قایل رہے۔مگر بلوغت کے بعد ان کا ذہن اشتراکیت کی طرف مایل ہو گیا تھا.... پھر بھی وہ رسموں کے مقابلے میں روح مذہب کے قایل تھے وہ حضرت رسول اللہؐ سے خاص لگاؤ رکھتے انھیں نبی برحق تسلیم کرتے اور سبھی دیگر مذہبی پیشواؤں کی تحریم واجب گردانتے تھے۔اس گھریلو تربیت کا فیضان ہی کہا کہ ابتدا ہی سے انھیں برائیوں سے نفرت، عجز و انکسار اور خدا ترسی کی عادت تھی، کارل مارکس کی تعلیمات سے متاثر تھے اور اشتراکیب کو امن عالم کے لیے ضروری گردانتے تھے۔ جدوجہد آزادی میں انھوں نے اپنے قلم سے سرگرم حصہ لیا اپنے نغمات سے جذبہ حب الوطنی کا صور پھونکنے میں پیش پیش رہے اسٹالن کے بعد روس کی سیاسی تبدیلی کا ان کو رنج تھا۔ غالباً اس کے بعد وہ سیاسی شاعری اور سیاست سے کنارہ

---

[۱] انداز نظر (گھر کا بھیدی) صفیہ اختر ص ۹۰-۹۱

کش ہو گئے تھے ہندوستانی رہنماؤں میں جواہر لعل نہرو، بھیم راؤ امبیڈکر اور سبھاش چند بوس سے متاثر تھے۔ وضع قطع کے لحاظ سے مشرقی تہذیب کے دلدادہ تھے اگر ان کو اردو تہذیب کا امین کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا۔

جاں نثار فطری طور کم سخن تھے لیکن محفل احباب ہوتو ان کے جوہر دیکھنے کے قابل ہوتے تھے بات سے بات نکالتے رہتے۔ اکثر اپنی یاداشت سے پرانے قصے اور واقعات خوشگوار لطیفوں کی طرح سناتے رہتے یہی نہیں دوستوں کو بھی ایام گذشتہ کی باتیں یاد دلا کر ان سے سنا کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں صفیہ لکھتی ہیں۔

''احباب کے معاملے میں اختر کی طبیعت خاص دیر آشنا ہے۔ خود کبھی پیش قدی کر کے کسی سے ملنے کے علوی نہ تیزی سے ربط ضبط بڑھانے کے قایل البتہ ہم مذاق اور ہم مسلک دوستوں سے ان کی وفاداری استوار ہے ان کے تذکروں سے تنہائی کے لمحوں میں گرمی اور روشنی پیدا کرنا اختر کا محبوب مشغلہ ہے بے تکلف دوستوں کی محفل میں اختر کی کم گوئی کے بند ٹوٹ جاتے ہیں اور وہ گفتگو میں خاص مستعدی اور گرما گرمی سے شریک نظر آتے ہیں۔ ایسی محفلوں میں اختر کی کم گوئی اور سنجیدگی قائم نہیں رہ پاتی جب وہ وصال دنیا سے سرشار ہو چکے ہوں۔'' [۱]

اسی طرح حفظ الکبیر کا یہ خیال بھی ملاخطہ ہو ان تمام روایات سے یہ اندازہ لگانا قدرے

---

[۱] انداز نظر صفیہ اختر (گھر کا بھیدی) ص ۸۸

دشوار نہیں کہ اختر کم سخن تھے۔ لیکن دوستوں بالخصوص شراب اور شاعری کی محفلوں میں وہ بند سکوت کو قائم رکھنے کے خوگر نہیں تھے یہی وہ لمحات ہوتے ہیں جب وہ شعر کہتے ہیں۔

''اختر مجلس زندگی میں بڑا کم سخن ہے لیکن شاعری میں اس کے جوہر خوب کھلتے ہیں۔ یا اس وقت جبکہ مردن افگن سے اچھی طرح حوصلہ آزما چکا ہو۔ ایسے وقت اس کی کیفیت ہی کچھ اور ہوتی ہے باتوں میں بلا کا تسلسل آ جاتا ہے خیالات بڑی روانی سے ہر موضوع پر خود بخود ظاہر ہونے لگتے ہیں۔'' [۱]

جاں نثار ظاہری طور پر سیدھے اور سنجیدہ ذراسی بات پر تبسم زیر لب وہ بھی ایسا کہ ہزاروں قہقہے جن پر تصدق ٹھٹے لگانا انھیں قطعی پسند نہیں تھا۔ لیکن اس کے ساتھ بلا کے نازک مزاج بھی تھے صفیہ اختر لکھتی ہیں۔

''اختر کی نازک مزاجی کو گوارا بنانے کے لیے گاندھی جی کے انہسائی قلب وجگر کی ضرورت ہے خود اپنا اول شیشہ سے سوا نازک کیوں نہ ہو۔ لیکن خوئے دوست کے نازک تر ہونے کا سوال ہے اس لیے اگر بلائے جان سنبھالے رکھتی ہے کسی موقع پر لہجے میں گفتگو میں تندی نہیں ہونا چاہیے ورنہ معاملات تخریب کی حد تک ایک جست میں پہونچ سکتے ہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ فطرت نے معاوضے کے طور پر ان میں بچوں کی سی معصوم مسرت کی صلاحیت بھی رکھ دی ہے جس سے شاید وہ زندگی

---

[۱] شاعر بمبئی ۱۹۵۸ء مضمون جاں نثار اختر اور اس کی شاعری از حفیظ الکبیر ص ۱۹

بھر محروم نہ رہ سکیں گے۔ اگر ان کی طبیعت میں چڑھ نہ پیدا کی جائے تو
وہ خود اپنی طرف سے شورش پیدا نہ کریں گے۔ اور دل آزادی کی
باعث نہ بنیں گے'' ۱

فاطمہ زبیر کا یہ تجزیہ جاں نثار کے مزاج کی آئینہ داری کرتا ہے ملاحظہ ہو۔
''بغیر کسی ظاہری سبب کی اکثر لمحوں میں اپنے کو تلخ و تنہا محسوس کرتے۔ انھیں ہر
وقت بہلانے اور خوش رکھنے کی ضرورت رہتی تھی۔ انھیں باتوں نے انھیں بے
حد نازک مزاج بنا دیا تھا بعض اوقات ذرا سی بات پر روٹھ جاتے تھے۔ صفیہ
نے ایک مصرعہ ان کے لیے ڈھونڈھ کر نکالا۔ جسے وہ اکثر دہراتی تھیں... ''
اک حسین ہر وقت ہو ان کے منانے کے لیے'' یا پھر آتش کا یہ شعر بھی وہ کبھی
کبھی پڑھا کرتی تھی۔

اس بلائے جاں سے آتش دیکھئے کیوں کر بنے
دل سوا شیشے سے نازک دل سے نازک خوئے دوست ۲

باایں ہمہ اختر کے مزاج میں ظرافت و بذلہ سنجی بھی داخل تھی۔ لیکن مخش اور گندے مذاق
سے انھیں نفرت تھی۔ ان کی باتوں سے بھی لطیف مزاج کا جھلکتا تھا اور ہمیشہ اس سے محفوظ
ہوتے رہتے تھے۔ ممبئی اردو بلٹز میں ''ہزاروں باتوں'' کے عنوان سے ان کی جو یادیں شائع

۱ انداز نظر از صفیہ اختر مضمون (گھر کا بھیدی) ص ۸۴
۲ حرف آشنا پیش لفظ فاطمہ زبیر ص ۹

ہوئی ہیں وہ تمام تر مزاجی کیفیت کی ترجمانی کرتی ہیں۔ مثلاً

''دس دن کا شاعر'' عسکری صاحب بھوپال کے مشہور کلاء میں
تھے اور اردو ادب کے دلدادہ اردو میں انیسؔ اور فارسی میں فردوسیؔ کے
عاشق ایک ناؤ و نوش کی محفل میں انیسؔ کے مرثیے پر مرثیے سناتے جا
رہے تھے میں تفریحاً کہا آپ انیسؔ کو اتنا کیوں اچھالتے ہیں۔ تین سو
پیسٹھ دن میں بے چارہ دس دن کا تو شاعر ہے وہ سنجیدگی سے خفا
ہوگئے۔ اور مجھ سے یک لخت ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ ایک مشاعرے کے
سلسلے میں سردار جعفری بھوپال آئے۔ انھیں اس بات کا پتہ چلا تو
عسکری کو لے میرے گھر آئے صلح تو ہوگئی لیکن مجھے اس کی قیمت یہ ادا
کرنی پڑی کہ چار گھنٹے تک انیسؔ کے مرثیے سننا پڑے''۔ [۱]

اختر کی پوری زندگی محرومی، مجبوری اور مہجوری میں بسر ہوئی۔ زندگی کی الجھنوں میں ذہنی توازن کو لکھنے پڑھنے کو لائق بنانا کارے دارد حتیٰ کہ سر سعدی شیرآزی یہاں تک کہ الجھنوں بالخصوص معاشی زبور حالی میں حضرت عشق بھی رفو چکر ہو جاتے ہیں۔

چناں قحط سالی شد اندر و عشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

یا خود انھیں کے قول کے مطابق

---

[۱] اردو بلٹز بمبئی ۲۶؍اکتوبر ۱۹۷۰ء ص۱۰

فرصت عشق بھی نہیں حاصل
آج انسان ہے بہت مشغول

لیکن اس کے باوجود اختر ان مواقع کو بھی نہایت مردانہ وار گذار دیتے تھے۔

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

ان کی فطرت بن چکی تھی، حفظ الکبیر لکھتے ہیں۔

''عام حالات میں وہ سیدھا سادہ سعادت مند قسم کا انسان بن جاتا ہے اور عموماً اپنے ہی پیدا کردہ ماحول میں گرفتار رہتا ہے۔ اس کی شخصیت اپنے اردگرد جو ماحول پیدا کر لیتی ہے اس میں اسکی طبیعت کا استغنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ایک فنکار کا متعلقات زندگی سے کیا رشتہ ہونا چاہئے۔ حصول زندگی کے لیے جس تگ و دو کی ضرورت ہوتی ہے بس اتنی ہی اختر سے ممکن ہے اختر کو جب بھی اس سے اطمینان ہو جائے وہ اپنی ذہن دنیا واپس آ جاتا ہے وہ اپنے دل کے اردگرد ایک سخت خول بنا لیتا ہے اور اپنی سوچ میں گم ہو جاتا ہے جانے وہ اپنے دل میں کیا راز کی باتیں کرتا ہے کس کی سنتا ہے اور کس کو کہتا ہے ایسے

موقعوں پر وہ ہجوم میں بھی تنہا رہتا ہے اور اس طرح اپنے غیر شاعرانہ

ماحول پر فتح پالیتا ہے۔" ۱

جاں نثار کا مذاق حسن یا ان کی پسند ایک انفرادی نوعیت کی ہے یہ قطعی ضروری نہیں کہ جو چیز دوسروں کو پسند ہو وہ انھیں بھی پسند ہو۔ اس ضمن صفیہ اختر لکھتی ہیں۔

"میرا اندازہ ہے کہ لطیف اور پاکیزہ حسن سے زیادہ انھیں شوخ حسن

Voluptuous متاثر کرتا ہے۔ جس کے معاملے میں وہ روحانی لطافت

سے زیادہ جواس کے کیف کے قایل ہیں۔" ۲

محبت کے معاملے میں اختر بڑے خوددار واقع ہوئے تھے۔ ان کی گہری محبتیں بھی خاموش ہی رہتیں اور زبان سے اس کا بیان یا اظہار مشکل ہی سے کرنے پر قدرت رکھتے تھے۔ انھیں اپنے جذبات کی پردہداری حد درجہ عزیز تھی بقول مومن (ع) اوروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا یا خود اپنے ہی ایک مصرعے کے مطابق (ع) دیکھ افشاں تیری الفت کا کہیں راز نہ ہو۔ جہاں تک جذبات محبت کی رازداری کی معاملہ ہے جاں نثار کسی پہلو سے اس راز کو افشاں کرنا پسند نہیں کرتے تھے حتیٰ کہ اولاد کو کون نہیں چاہتا لیکن جاں نثار سے ان کے بیٹے جاوید کے بارے میں پوچھا تو صاف انسان انکار دیتے تھے صفیہ اختر لکھتی ہیں۔

"محبت اور خیال کے بارے میں وہ ضبط کے قایل ہیں جسکا انھیں

جتنا خیال ہوگا اتنی ہی کڑی نظر رکھیں گے۔ اور اظہار سے بچیں گے

حد یہ ہے کہ بچے کسے عزیز نہیں ہوتے اختر کو جاوید کا غیر معمولی طور پر

---

۱ شاعر بمبئی ۱۹۷۸ء جاں نثار اختر اور اس کی شاعری از حفیظ الکبیر

۲ انداز نظر از صفیہ اختر مضمون (گھر کا بھیدی) ص ۸۹

خیال ہے چوری چھپے اس دلداری بھی کر لیتے ہیں۔ مگر زبان سے اس
کا اعتراف کرنے میں اپنی شکست سمجھتے ہیں بلکہ اگر کوئی بدقسمتی سے کہہ
بیٹھے کی وہ اسے چاہتے ہیں تو وہ ہر ممکن طریقے سے اس کی تردید
ضروری خیال کریں گے۔ اپنے احساس کی رازداری انھیں عزیز
ہے۔" [1]

ہندوستان میں اردو کے مستقبل کے بارے میں جاں نثار مطمئن نظر آتے ہیں اس طرح کا اظہار انھوں نے ایک موقع بھی کیا تھا۔ لیکن رسم الخط کے بارے میں ان کا یہ بھی خیال تھا کہ بغیر اپنے رسم الخط کے کوئی زبان زندہ نہیں رہ سکتی۔ ان کا یہ بیان ملاحظہ ہو۔

"میں ہندوستان میں اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔ جو
زبان کی کئی کروڑ لوگوں کی زبان ہو اسے آسانی سے مٹایا نہیں جا سکتا۔
اس وقت اردو ایک دور ابتدا سے گزر رہی ہے حکومت سے اپیلوں و
دستخطوں اور مختلف ادبی انجمنوں کی تجویزوں سے کوئی بات بنتی نظر نہیں
آتی اس لیے اردو دان طبقے کو عملی جدو جہد کرنی ہوگی اس زبان کو رکھنے
کے لیے شرط یہ ہے کہ ہر علاقہ میں اردو شہروں میں اردو میڈیم اسکول
قایم کیے جائیں اور ایسی ایک منظّم تحریک شروع کی جائے جس کا مطالبہ
ہو کر صوبائی زبانوں کے بجائے ہر فرد کو اس کی مادری زبان میں تعلیم
حاصل کرنے کی سہولت ہو... کسی بھی زبان کا رسم الخط اس زبان سے

---

[1] اندازِ نظر از صفیہ اختر مضمون (گھر کا بھیدی) ص ۹۰

وہی رشتہ رکھتا ہے جو جسم کا روح سے ہوتا ہے اگر اردو سے اس کا رسم
الخط چھین لیا جائے تو اردو باقی نہیں رہے گی۔''[1]

جاں نثار اختر خود بھی تلامذ ر الرحمٰن رہے۔ نہ کسی کے شاگرد ہوئے اور نہ کسی کو باقاعدہ اپنا شاگرد ہی بنایا۔ جیسا کہ انھوں نے محمد خالد نمائندہ فلم ویکلی کلکتہ کو ایک ملاقات میں بتلایا۔

''جہاں تک شاعری کا تعلق ہے استادی شاگردی کے طریقے کو میں کبھی روا نہیں رکھا جس زمانے میں علیگڈھ پی ایچ ڈی کر رہا تھا مجھے بی اے کے کلاسیز پڑھانے کے لیے دیے گئے ہیں۔ شکیل بدایونی اس وقت فورتھ ایر میں پڑھتے تھے اور سال بھر وہ کلاس میرے سپرد رہا۔ گوالیار وکٹوریہ کالج میں میرے گلباء جہاں قدر چغتائی اور ایوب مرزا وجدرہ چکے ہیں'' [2]

جاں نثار کا ادبی سرمایہ

جاں نثار کی شاعری کے چار مجموعے سلاسل، تار گریباں، جاوداں اور نظر بتاں اردو میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ انجمن ترقی اردو علیگڈھ کی جانب سے ان کے کلام کا انتخاب بھی شائع ہوا ہے ہندی رسم الخط میں ان کی نتیجۂ کلام جاں نثار اختر جیونی اور سنکلن۔

जान निसार अख्तर जीवनी और संकलन

کے نام سے شایع ہوا ہے۔ ان کی رباعیات کی مجموعہ گھر آنگن کے نام اشاعت پذید ہوا ہے ان کی غیر مطبوعہ رومانی شاعری کا مجموعہ زخم تمنا اور سہی (اب اس کے نام خاک دل تجویز ہوا ہے) مکتبہ شاہراہ دہلی سے چھپ چکا ہے۔ ان تمام مجموعہ میں کن ہی وجعدہ سے شامل نہیں ہے۔ ان سب کے علاوہ بہت سی نظمیں اور غزلیں ایسی بھی ہیں جو نظریات میں تبدیل آجانے سے انھوں

---

[1] [2] فلم ویکلی کلکتہ ۵رفروری ۱۹۷۱ء ص ۴

نے اپنے کلام سے خارج کر دیتی ہیں۔ نثر میں جاں نثار نے بہت کچھ لکھا ہے جو اکثر رسایل میں چھپتا لیکن کوئی مستقبل کتاب نظر سے نہیں گذری۔

ہزاروں باتوں کے عنوان سے ان کی جو یادیں ہفت روزہ بلڈز میں ہو چکی ہیں ان کو مستقبل قریب میں کتابی شکل دینے کی تجویز ہے۔ ہزاروں باتیں دراصل۔ Realteeist ہیں جنھیں آسانی سے فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے ان میں ظریفانہ چٹکلے مرقعے اور کچھ ادبی سیاسی محفلوں سے متعلق اہم الکشافات ہیں۔ کچھ دوستانہ صحبتوں کی مہذب چھیڑ چھاڑ ہے۔ ہزاروں باتیں ایک خاصے کی چیز ہے۔ اس سے ایک جدید صنف کی وجود میں آنے کے امکانات ہیں۔

جاں نثار کے کلام کا یک حصہ ایسا بھی ہے جس کا ترجمہ روسی، انگریزی اور فارسی زبان میں ہوا ہے ان کے کلام کا انتخاب پرکاش پنڈت نے صرف رسم الخط کی تبدیلی کے ساتھ راجپال اینڈ سنس دہلی کے توسط سے دیوناگری رسم الخط میں شایع کیا ہے۔ جس کا دیباچہ انھوں نے خود لکھا ہے اس کتاب کے ذریعے ہندی داں طبقے کو جاں نثار کی شاعری سے متعارف کرایا گیا ہے۔

جاں نثار کی کچھ نظموں کو امریکہ میں شایع ہونے اردو شعرا کے انتخاب کلام کے ساتھ بھی جگہ ملی ہے

جاں نثار کی یہ نظمیں اشترا کی تحریک سے متعلق ہیں۔ جاں نثار کی نظم آخری ملاقات کی روسی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ خلیق ابراہیم اور پروفیسر حشمت صاحب نے جاں نثار بعض نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ نظم شکست فسوں فارسی زبان میں ترجمہ ہو کر ایران میں اردو شعرا کے انتخاب میں شامل کیا گیا ہے۔

''خاموش آواز جاں نثار اختر کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے جنوری ۱۹۴۴ء سے جون ۱۹۷۵ء تک وقتاً فوقتاً صفیہ اور خدیجہ کو تحریر کیے ہیں۔ سبھی خطوط رومانی پیرائے دلچسپ مکالماتی انداز میں ہیں یہ کتاب مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی بھوپال سے ۱۹۸۱ء میں اشاعت پذیر ہوئی ہے اس کا یک صفحی پیش لفظ تابش صاحب سکریڑی مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی بھوپال نے تحریر کیا ہے:'' [۱]

---

[۱] خاموش آواز خطوط جاں نثار اختر بنام صفیہ اختر اور خدیجہ اختر مطبوعہ مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی بھوپال ۱۹۸۱ء

(باب دوم)

جاں نثار اختر کا عہد اور ادبی پس منظر

کسی فنکار کی تخلیقی اور طبعی شخصیت کی تشکیل اور تعمیر میں ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ مختلف النوع محرکات اور عوامل کا نتیجہ ہوتا ہے یہی محرکات یا عوامل متعلقہ فنکار کی شخصیت کی فروغ کا سبب بھی ہوتے ہیں شاعر کی تخلیقات میں جو شخصیت کام کرتی ہے وہ اس کی جبلی شخصیت نہیں بلکہ اس کی نفسیاتی اور اکثر اس کی اضافی شخصیت ہوتی ہے۔ انسان کے ماحول اور گردو پیش سے جس میں اس کی نہاد بھی شامل ہے یہی شخصیت اپنے عمل اور ردعمل میں ناہموار ہوتی ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ کن ہی ناہموار ماحول سے متاثر ہوکر شاعر پست ہمت یا قنوطی ہی ہو جائے یہ عین ممکن ہے کہ ناہموار حالات میں اس کا ردعمل اسے عملی اور جہد پیکار سے جھوجھنے والا انسان بنادے اور وہ اقبال کا ہم آواز ہوکر یہ سوچنے پر مجبور ہو کہ ۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت سے نہ نوری ہے ناری ہے

اور اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کسی ناروا اسلوک سے تنگ آ کر اسے زندگی ویران اور بے کیف معلوم ہونے لگے اور وہ یہ کہہ اٹھا ۔

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

یہی وہ کسوٹی اور معیار ہے جس پر کسی فنکار کو تولا یا دیکھا جا سکتا ہے۔ کوئی ادب محض حقیت کا عکاس یا زندگی کا آئینہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا بنیادی مقصد تنقید حیات ہے اس لیے کسی فنکار کی تخلیقات کی فنی قدر و قیمت کے تعین میں اس کے عہد کے سیاسی اور سماجی ماحول کا بھی جائزہ ایک لازمی امر ہے۔ اس سلسلے میں مجنوں گورکھپوری نے بڑی واضع روشنی ڈالی ہے وہ لکھتے ہیں۔

''ادیب کوئی راہب یا جوگی نہیں ہوتا۔ اور ادب ترک اور تپسیا کی پیداوار نہیں ہے ادیب بھی اس طرح ایک مخصوص ہیئت اجتماعی ایک خاص نظام تمدن کا پروردہ ہوتا ہے۔ جس طرح کہ کوئی دوسرا فرد اور ادب بھی ہماری معاشی اور سماجی زندگی سے اس طرح متاثر ہوتا ہے جس طرح ہمارے دوسرے حرکات وسکنات شاعر یا ادیب کو خلاق کہا گیا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں وہ ایک قادر مطلق کی طرح صرف ایک کن سے جو جی چاہے پیدا کر سکتا ہے۔ شاعر جو کچھ کہتا ہے اس میں شک نہیں ایک اندرونی اپچ سے مجبور ہو کر کہتا ہے۔ جو بظاہر النفر ادی چیز معلوم ہوتی ہے لیکن دراصل یہ اپچ ان تمام خارجی حالات اور اسباب کا نتیجہ ہوتی ہیں جن کو مجموعی طور سے تمدن یا ہیئت اجتماعی کہا جاتا ہے۔''

ایک ادیب کے سماج سے باہمی رشتے کا بخوبی اوراک مندرجہ اقتباس واضع ہو جاتا ہے کوئی بھی حساس فنکار سماجی حالات سے روگردانی نہیں کر سکتا بلکہ ہر حال میں وہ عصری اور سماجی

حقیقتوں کو اپنے دائرہ اظہار میں لائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جاں نثار اختر ایک باشعور قلمکار ہونے کے ساتھ نہایت حساس شخصیت کے مالک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں سماجی سچائیوں کی تصاویر اور ان کے اثرات کا پرتو جھلکتا ہے جاں نثار اختر نے آنکھ کھول کر جو زمانہ دیکھا وہ بین الاقوامی سطح پر ایک زبردست سیاسی اتھل پتھل اور افراتفری کا زمانہ تھا اور فاسٹ طاقتوں کے خلاف برسرِ پیکار ہونے کا دور تھا۔ صدیوں پرانے جاگیرارانہ نظام اور دبے کچلے اور ہر طرح کے مظالم کا شکار عوام کی بیداری کا دور تھا۔ جبکہ دوسری طرف فاسٹ طاقتیں اپنی ساری توانائیاں ان کی سرکوبی کے لیے صرف کر رہی تھیں۔ اس کشمکش کا نتیجہ ہے کہ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء) جیسے ہولناک دور کا سامنا ہندوستانی عوام کو کرنا پڑا۔ انگریز جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے روپ میں بظاہر تاجرانہ رویئے کے ساتھ ہندوستان وارد ہوئے تھے وہ حکمران بن کر ہندوستانی عوام کے ہر طرح کے استحصال میں سرگرم تھے۔ ۱۸۰۷ء ان مظالم تشدد اور افراتفری کے خلاف ہر محبِّ وطن کے دلوں میں انتقام کی آگ بھڑکنا شروع ہو چکی تھی۔ ستم رانیوں اور طوائف الملوکی کے اسی دور کا ایک ادنی سا کرشمہ یہ ہے کہ برطانوی حکومت کے لیے مادی وسایل کی فراہمی کا زبردست دباؤ ہندوستانی عوام کی گردنوں پر جس صورت میں ڈالا جا رہا تھا۔ اس کا نقشہ ڈاکٹر نریش چندر نے اپنے ایک مضمون میں اسی طرح کھینچا ہے۔

> ''ہر زمیندار سے اس کی حیثیت کے مطابق فوج کے لیے جوان مانگے جاتے تھے اگر وہ ایسے جوان مہیا نہیں کر سکتا تھا تو اس کو جوانوں کے لیے نقد روپیہ کی شکل میں معاوضہ دینا پڑتا تھا۔ جنگ میں انگریزوں کی کارفرمائی اور جرمینوں کے مظالم کی تشہید کے لیے ایک

ہفتہ وار اخبار ''لڑائی کا اخبار'' کے نام سے نکالا جاتا تھا جس کی خریداری ہر زمیندار کے لیے لازمی تھی۔ انگریزی طاقت کا ہندوستانیوں پر رعب جمانے کے لیے شہروں کیا گاؤں اور قصبوں تک میں انگریزوں کی فوجوں کی جن میں صرف سرخ فام انگریز ہی ہوتے پریڈیں نکالی جاتی تھیں'' [۱]

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے جاں نثار اختر نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے ملک کی انتہائی ابتر حالت دیکھی تھی پورے ملک میں سماجی اور معاشرتی نابرابری اور استحصال کا دور دورہ تھا انھوں نے دیکھا کہ ہر برطانوی اور افسران اور ان کے نمائندے کس طرح ہندوستانی عوام پر عرصۂ حیات تنگ کیے ہوئے تھے اس دور کو ہندوستان کی تاریخ کا ایک نہایت اہم اور نازک دور کہہ سکتے ہیں زندگی کے تمام شعبے سماج معاشرہ سیاست واقتصادیات وغیرہ ایک زبردست انقلاب کی زد میں آچکے تھے۔ ہندوستانیوں میں شکست خوردگی کے اثرات پوری طرح نمایاں تھے۔ انگریزوں کے قدم پوری مضبوطی سے جم چکے تھے۔ اوران کی اپنی گرفت سخت سے سخت ہوتی جارہی تھی، انتقام کی آگ ٹھنڈی کرنے اور دلوں میں خوف و ہراس اور ہیبت پیدا کرنے کے لیے برطانوی طاقتیں اپنی تمام تر قوتوں کا مظاہرہ کررہی تھیں۔ دوسری طرف ہندوستانیوں میں قومیت کا احساس پیدا کرنے کے لیے متعدد سماجی اور سیاسی جماعتیں مثلاً آریہ سماج انڈین نیشنل کانگریس مسلم لیگ وغیرہ اپنا کام کررہی تھیں۔ جاں نثار اختر نے اسی پرآشوب زمانے میں آنکھ کھولی تھی۔ اس زمانے میں روس میں بھی زارشاہی کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک چکی تھی۔

---

[۱] نیا دور لکھنؤ یادرفتگان نمبر ص ۹ مارچ تا ستمبر ۱۸۸۸ء

مزدور اور محنت کش عوام متحدہ طور پر اس جابر حکومت کا تختہ پلٹ دینے کے ہر طرح در پے تھے۔
تلک کی گرفتاری ۱۹۰۸ء کے بعد ہندوستانیوں کے دلوں میں بغاوت اور انگریز مخالفت کے
جذبات نے شدت اختیار کر لی تھی بمبئی کے ملوں کے کارکنوں نے ہڑتال شروع کر دی تھی۔ جسے
کچلنے کے لیے انگریزوں نے بے تحاشہ گرفتاریاں شروع کر دی تھیں۔ اس سے بجائے اس کے
کہ ڈر سہم کے عوام کے دلوں میں بھڑکی ہوئی یہ آگ فرد ہو جاتی اس آتش انتقام نے شعلۂ جوالہ
کا روپ اختیار کر لیا۔ برطانوی حکومت نے مزدوروں پر جو ظلم و ستم کا حربہ استعمال کیا تھا اس پر
خلیل الرحمٰن اعظمی روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''تین سال کے عرصے میں صرف بنگال کی عدالتوں میں
ساڑھے پانچ سو سیاسی قیدی پیش ہوئے پولیس نے اس بغاوت کو
بے دردی سے کچلا جگہ جگہ اسکولوں میں قومیت کے ترانے گائے
جانے لگے۔ طالب علموں کو اس جرم میں قید کیا جانے لگا۔ کچھ دنوں
کے لیے یہ تحریک ضرور دب گئی تھی لیکن ہندوستان کی مکمل آزادی کے
مطالبے کا بیج بھی پڑ گیا تھا'' [۱]

اس طرح ہندوستان میں بھی آزادی کی جدوجہد میں مزید تیزی آ گئی تھی۔ اور یہ زمانہ
پورے ہندوستان کے لیے تیز رو تبدیلی کا زمانہ تھا۔ زندگی کے نئے مسایل ضرور اٹھ کھڑے
ہوئے تھے۔ لیکن اس کا احساس بھی عام ہونے لگا تھا کہ ادب صرف جمالیات کے اذکار اور
لطف و انبساط کا سرچشمہ نہیں بلکہ اسے بدلتی ہوئی زندگی کی قدروں کا عکاس بھی ہونا چاہئے۔

---

[۱] اردو میں ترقی پسند تحریک ص ۲۲ خلیل الرحمٰن اعظمی

جس کا بنیادی مقصد ''تنقید حیات ہے'' اس سلسلے میں پریم چند لکھتے ہیں۔

''میرا منشہا نہیں کہ جو کچھ سپرد قلم ہو جائے وہ سب کا سب ادب ہے۔ ادب اس تحریک کو کہیں گے جس میں حقیقت کا عکس ہو جس کی زباں پختہ سشتہ اور لطیف ہو۔ جس میں دل و دماغ پر اثر ڈالنے کی صفت ہو۔ اور ادب میں یہ صفت کامل طور سے حالت میں پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح کی جب اس میں زندگی کی حقیقتیں اور تجربے بیان کیے گئے ہوں ادب کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں لیکن میرے خیال میں اس کی بہترین تعریف ''تنقید حیات ہے'' چاہے وہ مقالوں کی شکل میں ہو۔ یا افسانوں کی یا شعر کی اسے ہماری حیات کا تبصرہ کرنا چاہیے ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اسے حیات سے کوئی بحث نہیں۔ ہمارے ادیب اپنی تخلیقات کی ایک دنیا بنا کر اس میں من مانے طلسم باندھا کرتے تھے..... مگر ہمارا ادبی مذاق بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے۔ ادب محض دل بہلانے کی چیز نہیں ہے۔ دل بہلاو کے سوا اس کا اور بھی مقصد ہے وہ اب محض عشق و عاشق کے راگ نہیں الاپتا بلکہ حیات کے مسائل پر غور کرتا ہے۔ ان کا محاکمہ کرتا ہے اور ان کو حل کرتا ہے وہ اب تحریک یا الہام کے لیے حیرت انگیز واقعات تلاش نہیں کرتا یا قافیہ کے الفاظ کی طرف نہیں جاتا بلکہ اس کو ان مسائل سے دلچسپی ہے جس سے

سوسائٹی کے افراد متاثر ہوتے ہیں۔ ''[1]

برطانوی حکومت کے اقتدار کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب و تمدن کے اثرات ہندوستانیوں کی سماجی اور ثقافتی زندگی پر اثر انداز ہونے لگے تھے۔ انگریزی تعلیم کا اثر ہندوستان کی ثانوی زبانوں پر وہی ہوا جو رومانی تحریک (Remantic Revical) نے اٹھارھویں صدی کے آخر میں انگیریزی ادب پر کیا تھا۔ اور جس کے زیر اثر انگلینڈ میں ورڈس۔ ورتھ۔ کولرتج شیلی اور کٹیس جیسے نئی طرز شاعری کے مشہور زمانہ شعرا پیدا ہوئے تھے اس طرح جنگ آزادی کے بعد انگریزی تعلیم نے آزادی خیال اور وسعت کی نظر کی ایک نئی روح ہندوستانیوں میں پھونکی۔ انگریزی تعلیم کے اثر سے نوجوان طبقے پر یہ بات بھی پوری طرح روشن ہوگئی کہ شاعری کے دائرے میں صرف عشق ومحبت گل وبلبل اور شراب کباب ہی کے موضوعات شامل نہیں ہے بلکہ حیات وکائنات کے مختلف پہلو بھی شاعری کا موضوع بن سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ انگریزی شاعری نے نیچرل شاعری سے بھی روشناس کرایا جس سے اردو شعرا کے مطمح نظر میں فراخی اور ان کی شاعری میں وسعت پیدا ہوئی اس سلسلے میں ڈاکٹر ظفر قدوائی کا یہ کہنا درست ہے کہ..

''۱۸۰۷ء کے انقلاب سے پہلے شعرا کے یہاں عشق میں سطحیت پیدا ہوگئی تھی۔ حسن وعشق کا کوئی بلند تصور ان کے یہاں نہیں تھا بلکہ معشوق کے اعضا اور اس کے خدوخال کے افکار کو ہی وہ شاعری بالخصوص غزل کی روح سمجھنے لگے تھے حسن وعشق کی اس ارزانی نے

---

[1] ادب کے غرض وغایت پریم چند مشمولہ ترقی پسند ادب کے پچاس سال سفر۔ مرتب قمر رئیس وعاشور کاظمی ص ۱۶۰/۱۶۴/۱۶۴

شعرا کو اپنے فکری عناصر کی طرف متوجہ ہونے سے بڑی حد تک روک
رکھا تھا.........ادیب و شاعر سبھی اپنی ساری توانائیاں دوراز کار
تشبیہات اور استعارات کے استعمال میں صرف کر رہے تھے۔ یعنی
یہ الفاظ دیگر وہ لفظوں سے کھیل رہے تھے۔ اور ان کی شاعری میں
دہر یا خیالات اور ہمہ گیر جذبات کا فقدان ہو چکا تھا۔'' [۱]

انگریزی تعلیم کے اثرات اور اس نئے دور کے تقاضوں نے ادیب و شاعر کو ایک زبردست کشمکش میں مبتلا کر رکھا تھا ایک طرف قدامت اپنی طرف راغب کر رہی تھی تو دوسری طرف نئی رومانیت نئے تجربات و مشاہدات انھیں فکری تصورات سنانے کے لیے بلا رہے تھے.........چونکہ نئے تقاضوں سے معاشی حقیقتوں کا رشتہ قومی تھا اس لیے رفتہ رفتہ قدامت پرستی کے بادل چھٹنا شروع ہوئے اور ان کی جگہ ایک نیا ادب ابھر کر سامنے آنے لگا۔ اس سلسلے میں علی سردار جعفری رقم طراز ہیں۔

'' شاعر یا ادیب کے جذبات کو برانگیختہ کرنے والے محرکات
گرد و پیش کی اس دنیا میں پائے جاتے ہیں جہاں تمام انسان زندگی
بسر کرتے ہیں۔ اور یہ محرکات خود اسی سماجی اور اقتصادی نظام کی
پیداوار ہوتے ہیں جو انسان زندگی کی شیرازہ بندی کرتا ہے۔'' [۲]

اس طرح کا اک اظہار خیال رام بابو سکسینہ نے بھی ہندوستان میں انگریزی تعلیم کے اس رواج اور اس کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

---

[۱] جگت موہن لال رواں حیات اور ادبی خدمات ص ۶۷ ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۸۴ء
[۲] ترقی پسند مصنفین کی تحریک ص ۹۷ از علی سردار جعفری مشمولہ نیا ادب لکھنؤ

''انگریزی تعلیم کے اثر نے زبان اردو کو قدامت پرستی کی زنجیروں سے آزاد کیا جس نے لوگوں کے دل و دماغ کو ایسا جکڑ رکھا تھا کہ ان کے خیالات میں تنوع باقی نہیں رہ گیا تھا۔ اوران کی ذہانت وطباعی رنگ کوردہ ہوگئی تھی۔ ہندوستان کی دیسی زبانوں میں اسی کی وجہ سے کایا پلٹ ہوئی۔'' [۱]

انجمن پنجاب کا قیام ۱۸۷۴ء:

غدر کے بعد ہی مغربی تہذیب، وتمدن کے آفتاب کی گہری کرنیں ہندوستانی ادب بالخصوص اردو شاعری پر پڑنے لگی تھیں۔ لیکن ادب میں کوئی ایسا موڑ نہیں آیا تھا جو ہماری شاعری کو نیا آہنگ عطا کرتا ہے۔ اردو شاعری صرف غزل تک ہی محدود تھی دوسرے اصناف میں اس قسم کی روایتی اور رسمی مضامین دہرائے جاتے تھے۔ جس کا مقصد صرف داد وتحسین یا امرا اور رؤسا کی خوشنودی حاصل کرنا تھی۔ اس زمانے میں قوم کی حالت حد سے زیادہ پست دیکھ کر مصلحان قوم اور اردو کے ہی خواہوں نے یہ شدت سے محسوس کیا کہ اگر اردو شاعری کا یہی طور رہا تو نہ صرف اردو کا نام صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا بلکہ ساری قوم کا شیرازہ بھی بکھر جائے گا ان حالات میں قوم کی اصلاح اسی صورت میں ممکن ہے کہ ایسی شاعری یا ادب وجود میں لایا جائے'' جو روح کو تڑپا دے اور قلب کو گرما دے''۔ اس وقت ضرورت ہے کہ روشِ قدیم سے الگ ہٹ کر نیچرل اور متفرق ومتنوع مضامین پر مضامین اور نظمیں لکھی جائیں جن میں جوش بھی ہو اور اصلیت بھی اس مقصد کے تحت محمد حسین آزاد نے میجر فلر کی معیت میں انجمن پنجاب کی

---

[۱] تاریخ ادب اردو ص ۱۰۴۸ رام بابو سکسینہ (تیج کمار پریس لکھنؤ)

بنیاد ۱۸۷۴ء میں لاہور میں ڈالی۔ اس انجمن کی طرف سے ماہانہ مشاعروں کی شروعات کی گئی ان مشاعروں میں ہر ماہ پڑھنے کے لیے نیا موضوع بتا دیا جاتا تھا۔ یہی نظمیں آگے چلکر جدید شاعری کا سنگ بنیاد ثابت ہوئیں رفتہ رفتہ اردو شاعری میں نیا موڑ اور نیا آہنگ پیدا ہونا شروع ہوا۔ آزاد کے دوش بدوش مولانا حالی بھی اس انجمن کے رکن تھے۔ آزاد اور حالی کی کوششوں کو سراہتے ہوئے رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں.

'' آزاد اور حالی کو اردو شاعری کے جدید رنگ کا بانی سمجھنا چاہئے۔ انھوں نے طرز قدیم کی اردو شاعری پر جس میں تصنع تکلف اور خلاف واقعہ باتیں جز دغالب تھیں ضرب کاری لگائی اور اسے تصنع وتکلف اور فرسودہ رسمی روایات سے آزاد کیا'' [۱]

علیگڈھ تحریک :

غدر کے بعد ہندوستانیوں کو متحد کرنے اور انھیں روشن شاہ راہ دکھانے کا کام سرسید نے کیا۔ سرسید ہی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ہندوستانیوں میں نئی بیداری پیدا کی اور ان کی پست اور شکست خوردہ ذہنیت کو بدلنے کی کوشش کی۔ اور انھیں راہ عمل دکھا کر انھیں اپنے بارے میں کچھ سوچنے اور اسے عملی جامہ پہنانے پر مجبور کیا۔ سرسید نے قوم کی زبوں حالی کا اندازہ کیا اور ہر ممکن طریقے سے قوم کو اس کی عظمت ماضی کی یاد دلا کر آگے بڑھنے اور ترقی کی راہ میں گامزن ہونے کے لیے اکسایا۔ اپنے کام کو آگے بڑھانے اور مشن کو تیز تر کرنے کے لیے انھوں تہذیب

---

[۱] تاریخ ادب اردو ص ۱۴۰۴ رام بابو سکسینہ (تیج کمار پریس لکھنؤ)

الاخلاق کا اجرا کیا۔ جس نے ہندوستان میں وہی کام کیا جو انگلستان میں ٹیٹلر اور اسپیکٹر (Tetler & Spectator) نام کے جرائد نے انجام دیا تھا۔ انھیں کی کوششوں سے روایت اور تقلید کے سیلاب سے الگ ہٹ کر مقفع اور مسجع کی جگہ صاف اور سادہ زبان سے اردو ادب کو روشناس ہونے کا موقع ہاتھ آیا اور سادہ اور سلیس زبان تقریر و تحریر دونوں میں مقبول ہوئی۔ اس ضمن میں مولانا حالی لکھتے ہیں۔

''اردو شاعری جس میں دو۲ سو برس تک ایک ہی قسم کے خیالات برابر دہرائے جارہے تھے۔ اس نے بھی اسی پرچہ تہذیب الاخلاق سے کروٹ لی شعرا نئے نئے میدانوں میں قدم رکھنے لگے اور شاعری بجائے اس کے کہ ایک دل لگی کی چیز سمجھی جاتی تھی اب کام کی چیز بننے لگی'' [۱]

تہذیب الاخلاق دراصل سرسید کے خیالات کا نہ صرف نقیب تھا بلکہ اسے ان کی آرزؤں کا آئینہ خانہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس پرچے کے دائرہ کار میں اردو زبان کی اہمیت اور افادیت کا پرچار بھی شامل تھا۔ مسلمانوں کو مایوسی اور پس ہمتی کے غار سے نکالنا مذہب کو عقلی دلائل کی اساس فراہم کرنا اور سنجیدہ عملی کاموں میں اردو کا استعمال کرنا اور اس کے ادب کو اعلیٰ معیار تک پہونچانا سب ہی کچھ اس کے مقاصد میں شامل تھا۔ علیگڈھ تحریک سرسید کے تدبیر تفکر بلندحوصلگی بصیرت علوئے تخیل کا ایک نادر کرشمہ ہے۔ سید احتشام حیسن رضوی رقم طراز ہیں۔

''اس تحریک کے اساس پہلوؤں میں نئے علم کا حصول مذہب کے عقلی علوم کی تفہیم سماجی اصلاح اور زبان و ادب کی ترقی اور سربلندی

---

[۱] حیات جاوید حصہ ازحالی ص ۶۱ مملوکہ مظہر لائبریری لکھنؤ

شامل ہے۔'' [۱]

اس میں شک نہیں کہ علیگڈھ تحریک نے ادبی سطح پر اردو زبان کو ایک نئے رنگ اور آہنگ سے روشناس کرایا۔ غالب کی نثر اسی وقت ضرور موجود تھی لیکن یہ نثر روز مرہ کے مسائل کا سہارا نہیں بن سکتی تھی۔ علیگڈھ تحریک کا مقصد عوام کے دلوں کی دھڑکن بننا تھا۔ اس لیے شاعری صرف اس تحریک کے غایتی اغراض کی کفیل نہیں ہوسکتی تھی۔ جب کہ علیگڈھ تحریک اردو نثر کا ایک باقاعدہ سنجیدہ مشن اور ساحرہ طرز فکر وضع کرنا چاہتی تھی۔ اس تحریک نے سستی جذباتیت کو بڑھاوا دینے کے بجائے گہرے تعقل مفکرانہ سنجیدگی تدبیر اور شعور کو پروان چڑھانے کا عہد کیا تھا۔ علیگڈھ تحریک نے سائنس نقطۂ نظر اور اظہار کی صداقت کو اہمیت دی۔ اس تحریک نے زندگی کی جمالیات کو بڑھاوا دینے کے بجائے زندگی کی مادی قدروں کو زیادہ اہمیت دی۔ اس طرح ادب کو ایک ایسا وسیلہ بنایا جو زندگی کا ترجمان بننے کے ساتھ اسے مائل بہ ارتقاء کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ ادب کا یہی افادی پہلو بیسویں صدی میں ترقی پسند تحریک کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اس اعتبار سے سرسید احمد خاں بقول ڈاکٹر سید عبداللہ

''سب سے پہلے ترقی پسند اور نقاد تھے''

سرسید نے صرف ادیب یا اس کی تخلیق کو ہی اہمیت نہیں دی بلکہ اس کے پڑھنے والے کو بھی اہم ظاہر کیا۔ سرسید کا ایک نمایاں کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے غزل کے بجائے نظم کو زیادہ اہمیت دی اور حالؔی کو اپنی مشہور زمانہ مدس مدو جزرِ اسلام لکھنے کی ترغیب دی۔ سرسید کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اردو شاعری بھی انگریزی نیچرل پوئیٹری بن جائے۔ بعد میں اس نیچرل

---

[۱] علی تحریک کے اساس پہلو ص ۳۹ مرتبہ نسیم قریشی

شاعری کو آزاد اور حالی نے بڑھاوا دیا جو آگے چل کر جدید نظم نگاری کی بنیادی اساس بن گئی اور ادب کو قومی سطح پر اصلاح کا وسیلہ بننے کی صلاحیت حاصل ہوئی۔ بحیثیت مجموعی اگر دیکھا جائے تو نیچرل شاعری کی شروعات سے لیکر ۱۹۳۵ء تک کے زمانہ کو اردو نظم کی تعمیر وتشکیل کا دور کہا جا سکتا ہے۔

ترقی پسند تحریک :

اردو میں جتنی تحریکیں ابھریں ان میں ترقی پسند تحریک سب سے فعال اور نظریاتی بنیادوں پر استوار ایک متحرک تحریک ہے اس تحریک کی ابتدا ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ کی پہلی کل ہند اردو کانفرنس سے ہوئی۔ جس کی صدارت مشہور ناول اور افسانہ نگار منشی پریم چند نے کی تھی انھوں نے اس انجمن کے اغراض مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا تھا۔

> ''مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ میں اور چیزوں کی طرح آرٹ کو بھی افادیت کی میزان پر تولتا ہوں بے شک آرٹ کا مقصد ذوق حسن کی تقویت ہے لیکن کوئی ذوق معنوی یا روحانی مسرت نہیں جو اپنا افادی پہلو نہ رکھتی ہو۔ ہمیں اب حسن کا معیار بدلنا ہوگا۔ ابھی تک اس کا حسن امیرانہ اور عیش ورانہ تھا اس کی نگاہیں محل سراؤں اور بنگلوں کی طرف اٹھتی تھیں۔ جھونپڑے اور کھنڈر اس کے لیے التفات کے قابل نہ تھے۔ انھیں انسانیت کے دامن سے خارج سمجھا جاتا تھا۔ آرٹ نام تھا محدود صورت پرستی کا الفاظ کی ترکیبوں کا خیالات کی بندشوں کا زندگی کا کوئی آئیڈیل نہیں۔ زندگی کا کوئی اونچا مقصد نہیں۔'' [۱]

---

[۱] اردو میں ترقی پسند تحریک ص ۴۳ خلیل الرحمٰن اعظمی

ان خیالات کی روشنی میں ترقی پسند ادیبوں نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا۔اس سے متاثر ہو کر اختر رائے پوری نے اپریل ۳۶ء ناگپور میں ساہتیہ پریشد کے تاریخی اجلاس کے موقع پر ادب اور زندگی کا استفام عام کیا اور ان خیالات کے واضع طور پر ظاہر کرنے کے لیے ایک اعلان نامہ بھی پڑھا جس پر مولوی عبدالحق۔ اچاریہ نریندر دیو اختر حسین رائے پوری۔ اور پنڈت جواہر لال نہرو نے دستخط کیے تھے۔خلیل الرحمٰن اعظمی نے ترقی پسند ادب کی تعریف یوں کی ہے...

> ''ہمارے نزدیک ترقی پسند ادب وہ ہے جو زندگی کی حقیقتوں پر نظر رکھے ان کا پرتو ہو۔ان کی چھان بین کرتا ہوں اور ایک نئی اور بہتر زندگی کا راہبر ہو۔لیکن وہ صرف زندگی کے ہلچل اور ہیجان کا ہی نقیب اور نبض شناس نہیں ہوتا وہ صرف سطح پر کروٹ لینے والی موجوں کے ساتھ نہیں بہتا بلکہ زندگی گہرائیوں میں جا کر ان خاموشی اور میٹھے دھاروں سے سیراب ہوتا ہے جو سطح سے نیچے بہتے رہے ہیں۔''[1]

سیاسی پس نظر:۔

ایک طرف بین الاقوامی حالات تھے اور دوسری طرف ملک کی سیاسیت میں بھی ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ ہندوستان کی قومی آزادی کی تحریک خاص کر انڈین نیشنل کانگریس میں دو گروہ تحریک آزادی کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لینے کے لیے ابتدا ہی سے کشمکش میں تھے۔

---

[1] اردو میں ترقی پسند تحریک ص ۴۳ خلیل الرحمٰن اعظمی

عوام کے باغیانہ جذبات اور جوش کی نمائندگی گرم دل کے لوگ کر رہے تھے جن میں آر بندو گھوش، بپندر چند پال، لالہ لاجپت رائے اور بال گنگا دھر تلک شامل تھے۔ اور دوسرے نرم دل کے رہنماؤں میں گاندھی جی۔ موتی لال نہرو۔ جواہر لعل نہرو اور دوسرے لوگ تھے۔ مزدوروں اور کسانوں کی سبھائیں اپنے سیاسی مطالبات کے لیے جدو جہد کر رہی تھیں۔ جگہ جگہ ٹریڈ یونین بسنے لگیں۔ جس کا اثر کانگریس پر بھی پڑا۔ ان حالات سے اردو ادب نہ صرف متاثر تھا بلکہ اردو شاعری اور شاعروں نے ایک تہلکہ مچا رکھا تھا اقبال کے وطنی ترانے چکبست کی دلولہ انگیز قومی شاعری سرور جہاں آبادی اور دوسرے قومی نظم نگاروں کے رشحات قلم ملکی آزادی اور سامراج دشمنی کی آگ دلوں میں بھڑکا رہی تھی۔ اقبالؔ کی شاعری میں سرمایے اور محنت کی کشمکش پر اظہار خیال ہونے لگا خضر راہ سے انقلابی نقطہ نظر کی حمایت ملتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی حلیہ گری کے مقابلے میں مزدور طبقے کو پیغام دیا گیا۔

اٹھو میرے دنیا کے غریبوں کو جگا دو

کاخ امرا کے درو دیوار ہلا دو

جیسے شعر کہے جا رہے تھے۔ ساقی نامہ اور لینن خدا کے حضور جیسی نظمیں انقلاب کا پیغام عام کر رہی تھیں درج ذیل شعر میں اقبال کی فکر اور اس دور کے منتظر ہونے کا عکس ہے جب سرمایہ دارانہ نظام ختم ہو جائے گا۔

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ

دنیا ہے تری منتظر اے روز مکافات

اور یہ اشعار بھی دیکھئے۔

گیا دور سرمایہ داری گیا

تماشا دکھا کر مداری گیا

ہمالے کے چشمے ابلنے لگے

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے

پرانی سیاست گری خوار ہے

زمیں سپرد سلطان سے بیزار ہے

اس زمانے میں جوش، سیماب، روش صدیقی، ساغر، حفیظ، جمیل مظہری احسان دانش وغیرہ کی قومی سیاسی اور باغیانہ نظمیں جوش وخروش کا ایک ماحول بنائے ہوئے تھیں نیاز اور دوسرے مذہب بیزار اہل قلم سے نوجوان طبقہ متاثر ہو رہا تھا۔ غرضکہ ہندوستانی سماج میں بڑی بری تبدیلیاں پیدا ہوری تھیں۔ پرانے خیالات واعتقادات کی جڑیں کھوکھلی ہو رہی تھیں۔ اور ایک نیا سماج جنم لے رہا تھا۔ انقلاب کا جوش ہر ادیب وشاعر کی گونج بن چکا تھا ایسے میں جوش نے کمپنی سرکار کی مجرمانہ حرکات۔ ہندوستان کی صفت کو تباہ کرنے کی سازش بیگمات اودھ کے

ساتھ کیے گئے ۔ ناروا سلوک ٹیپو سلطان بہادر شاہ ظفر کے ساتھ کیے گئے مظالم مجاہدین آزادی سردار بھگت سنگھ جیسے نوخیزوں کو دی جانے والی پھانسیاں ۔ اور قید فرنگ میں سیاسی قیدیوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کی عبرتناک داستان ہمارے شعرا کے اہم موضوعات تھے جوش نے آگاہ کیا کہ اے فرنگیو ؂

اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی

وقت کا فرمان اپنا رخ بدل سکتا نہیں
موت ٹل سکتی ہے اب فرمان ٹل سکتا نہیں

۱۹۰۸ء پریم چند کی انقلابی کہانیوں کا مجموعہ سوز وطن اور ۱۹۱۴ میں شبلی کی نظم ہنگامہ بلغان ضبط کی گئی اس کی تصویر فیض کی نگاہ میں تھی وہ اس کے رد عمل ہی بیانگ ذیل کہتے ہیں ؂

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقہ زنجیر میں زباں میں نے

درِ قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے
تو فیض دل میں ستارے ابھرنے لگتے ہیں

نازش پرتاب گڑھی اس طرح لکھتے ہیں ؎

لاکھ تخریب ہو تعمیر نہیں رک سکتی
زندگی وقت کے قدموں پہ نہیں جھک سکتی
جب بھی انسان نے پستی سے ابھرنا چاہا
جب کبھی گیسوے ہستی نے سنورنا چاہا
اس گھڑی موت کے پیاروں کو جلال آیا ہے
کالے قانون کے سینے میں ابال آیا ہے

اور سب سے سخت رویہ کا یہ شعر:

ظلمتوں نور کے دھارے سے نہ ٹکراؤ تم
غاصبو صحن گلستاں سے نکل جاؤ تم

ساحر لدھیانوی:۔

شہطانیت کے تصور کے ساتھ ہی ظلم وجبر جلال جبروت کا تصور بھی لازمی ہے ان حالات میں ساؔحر نے اس طرح کہا ہے ؎

کیسے ہر شاخ سے منہ بند مہکتی کلیاں
توڑ لی جاتی تھیں تزیین حرم کی خاطر
اور مرجھا کے بھی آزاد نہ ہوسکتی تھیں
ظل سبحان کی عظمت کے بھرم کی خاطر

مجاؔز :۔

اس دور کی پیداوار مجاز کی بیشتر انقلابی نظمیں اعلی اور کامیاب شاعری کے میعار پر بقول اسلوب احمد انصاری پوری نہیں اتر تیں پھر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو شاعری کو جو تصویر جوش نے دیا تھا مجاز نے اسے بے کم وکاست قبول کرلیا تھا۔اس سلسلے میں ملک کی آزادی یا سرخ آندھی کا پیغام انھوں نے کچھ اس طرح دیا ہے

کوہساروں کی طرف سے سرخ آندھی آئے گی   جابجا آبادیوں میں آگ سی لگ جائے گی
توڑ کر بیڑی نکل آئیں گے زندان کے اسیر

مختصر یہ کی دور حاضر کی شاعری مجاز تریاک عجیب مظہر کی حیثیت کے حامل ہیں۔ اور ۱۹۳۵ء کے بعد کے شاعروں کا کوئی تذکرہ مجاز کے نام کے بغیر مکمل نہیں ہو سکے گا۔

یہی وہ سیاسی سماجی اورادبی ماحول تھا۔ جس سے جاں نثار اختر متاثر ہوئے۔ اور اپنے ادب کو پروان چڑھایا اس ماحول اور فضاؤں کی جھلک ان کی شاعری میں نظر آتی ہے۔

جاں نثار اختر نے نہ صرف یہ کہ اپنے ادب کو وقت کے اس دھارے کا رخ دیا بلکہ ترقی پسند تحریک کے سرگرم رکن ہوکر اور حیات اللہ انصاری، اسرارالحق مجاز، اختر حسین رائے پوری، خواجہ احمد عباس، فیض احمد فیض، شاہد لطیف اور سبط حسن کے دوش بدوش ہوکر روایتی ادب سے انحراف کر کے جدید طرز کی انقلابی، فکری اور وقت کی ترجمانی کرنے والی شاعری کو عام کرنے کی سعی بلیغ کی ہے۔

(باب سوم)

جاں نثار اختر بحیثیت شاعر اور ان کی شاعری کے مخصوص خدوخال

جاں نثار اختر بحیثیت غزل گو

یوں تو غزل کے لغوی معنی ''حکایت با یار گفتن، گفتگو با زنان کرف گفتنگو زنان کردن با عشق انسان

کردن'' ہیں۔ جو ایک حد تک ایک مخصوص جہت کو منظر نگاہ بنا کر اس کی تنگ دامانی کی طرف اشارہ کرتے ہیں لیکن آج غزل کا جو روپ ہمارے سامنے ہے وہ ہی خواہاں ادب کی ان تھک کرم فرمائیوں کا رہن منت ہے جن کی بدولت غزل کا دامن اب اتنا وسیع ہو چکا ہے کہ اس حیات اور کائنات کے سارے موضوعات نظم کیے جاتے ہیں اور ہر جگہ ہر موقع پر اس کے دامن کی فراخی ہر طرح کے مضامین اپنے اندر سمو لینے کا ملکہ رکھتی ہے آج کی غزل عہد آزاد حالی کے دور کی وہ غزل نہیں رہ گئی ہے جس پر بجا طور پر اعتراض کرتے ہوئے حالی نے کہا تھا وہ'' شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر'' یا جسے بیکاروں کا مشغلہ کہہ کر'' بھی اس سے صرف نظر کرنے کو ہی بہتر گردانا جاتا تھا۔ آج غزل اردو کی آبرو بن اپنے جوہروں کی تابانی سے ہمارے دیدہ و دل کو منور کرنے کا اور ہمارے ہر طرح کے جذبات و احساسات کے اظہار کا وسیلہ بنکر دیگر اصاف سخن کے مقابلہ میں سر افتخار بلند کئے ہوئے محسوس ہوتی ہے۔ اگر ہم ایک دوسرے زاویہ سے اس کے تعین قدر کے سلسلے میں اس پر نگاہ ڈالیں تو دیکھیں گے کہ اردو کے قریب ہر شاعر نے شعر گوئی کی ابتدا غزل سے ہی کی ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ بعد میں انھوں نے اپنے اشہب فکر کی باب کسی دوسری صنف کی جانب موڑ کر اپنی طباعی کے جوہر دکھائے ہوں۔ اس طرح شاید یہ مبالغہ آرائی نہ ہو کہ قصہ شاعری کی خشت اول غزل ہے۔ یہ اردو شاعری کا ایسا پرفضا گلستاں ہے جسکو سیکڑوں برس سے شعرا نے اپنا خون جگر دے کر اسے تازگی اور حسن عطا کیا ہے۔ اس حقیقت کے اظہار میں گنجائش کلام نہیں ہے۔ اردو کے ایسے شاعروں کو جنھیں مقبولیت اور عظمت ملی ان میں کثرت

غزل گوشعرا کی ہی ہے۔

عہد حاضر میں ایسے شعرا کی کمی نہیں ہے جونظم گوئی میں سیرت رکھنے کے باوصف نہایت بامعنی اور بامقصد بہترین غزلیں کہتے ہیں۔ ایسے شعراں کی غزلوں میں اور دور حاضر کی ہیجانی زندگی کی ترجمانی سماج اور معاشرت کی عکاسی، اور تقاضوں وقت کی ترجمانی نہات سلیس سادہ زبان اور پراثر اسلوب میں پیش کی جارہی ہے۔ اسی میں شک نہیں ہے کہ اردو غزلوں بدلتے ہوئے سیاسی حالات اور نت نئے سماجی تقاضوں کے بنا پر موضوع اور امواد طرز فکر میں نمایاں تبدیلی ہوتے رہنے کی وجہ سے شعرا حقیقت اور واقیعت کے اظہار کی کوشش میں شاعری کو زندگی کا ترجمان بنا کر پیش کر رہے ہیں اور مزاج شاعری اور اسلوب میں ایک تفکرانہ تنوع اور ہم آہنگی کی جھلک نمایاں ہے۔ قدیم شاعری کی روایتی اور رجعت پسندی۔ تو ہم پرستی بے روح تصوف اور بے مقصد رومانیت کے بادل چھٹتے جارہے ہیں۔ آج کی غزل میں انسانی اقدار کی تلاش کے ساتھ معاشرتی اور عمرانی تصورات کی جستجو بھی نظر آتی ہے۔ غزلوں کے ہی وسیلے سے انسانیت کی بازیافت اسباب آسائش وحیات کی تلاش وفکر کی کوششیں کی جاتی ہیں غرضکہ انسانی زندگی کے جملہ مسائل کی ترجمانی اس میں کی جارہی ہے ولیؔ دکنی سے غالبؔ کے دور کے قریب ڈیڑھ سو سال میں غزل نے فنی اعتبار سے بلندی کے تمام مراحل طے کر کے شاعری کی مقبول ترین صنف کا مقام حاصل کر چکی تھی۔ اور غزل کا یہ بانکپن یہ حسن وکشش جاذبیت دلکشی اور اس کوشش کی اپنی منت ہے جو آزادؔ اور حالیؔ کی فکر اور اصلاح شاعری کے جذبہ کی بنا پر آج سے حاصل ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ آج کی دور کی غزل (جدید غزل) قدیم غزل کا ہی ترقی یافتہ

روپ ہے پھر بھی آج کی زندگی اور تقاضے عہد قدیم سے بڑی حد تک بدل چکے ہیں اس لیے غزل میں اجتمائی نقطہ نظر کا پرتو جھلکنے لگا ہے پھر بھی قدامت پرست ایسے بھی نظر آہی جائیں گے جن کے نزدیک غزل ہمارے پست ذہن وفکر کی آئینہ داری کر رہی ہے ایسے ہی لوگوں کو اقبال نے بہت پہلے آگاہ کیا تھا۔

آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کھٹن ہے قوموں کی زندگی میں

آج اردو شعرا نے اس راز کو بخوبی سمجھ لیا اور آئین نو سے خوف زدہ ہونے کے بجائے اسے لپک لپک کر گلے لگانے کے ذریعے محسوس ہوتے ہیں۔ جزبہ وفکر الفاظ زباں میں بدلاؤ نے غزل کو ایک نیا نکھار اور دلاویزی عطا کی ہے چنانچہ ہم آج فخر سے کہنے کے مجاز ہیں کہ آج کے دور کی غزل کا سرمایہ قدیم دور کے سرمایہ ادب کسی طرح کم دقیع اور گم سوار نہیں ہے۔ جان نثار اختر کے آج کی غزل کی اہمیت جتاتے ہوئے کہا تھا۔

> ''ہمارے فن ادب اور سماج اپنے ارتقا کے لیے نئی نسل سے نئے خون کا تقاضا کرتے ہیں۔ غزل و پیار ادب کی شاندار روایت ہے اور جس کے بعید اردو شاعری کا تصور ممکن نہیں۔ جس کا نام آتے ہی صدیوں کی تہذیب سمٹ کر ہمارے سامنے آنے لگتی ہے۔ ہماری جذباتی اور وجدانی کیفیات ہماری معاشرت تمدن اور اخلاق کے

ہزار ہا ایک ہزاریاں جھلکیاں اپنے چہرے سے نقاب سرکاتی نظر آتی ہیں۔ آئینہ عظیم الشان ورثے کے طور پر یہ نئی نسل تک پہونچی ہے''۔ [۱]

اس مین شبہہ کی گنجائش نہیں ہے کہ آج کی غزل صرف لفاظی بے روح خیالی آرائی اور دماغ سوزی کی غزلوں سے گزر کر ایسی کائنات میں داخل ہو چکی ہے جہاں سماجی شعور انسانیت سے لگاؤ اور تہذیب رکھ رکھاؤ سادگی زبان میں فنی اعتدال پسندی۔ احساس جمال کے رنگ و روغن سے اپنی شاعری کی دلفریبی عطا کر رہا ہے۔ جان نثار اختر نے صنف غزل کے حق میں یہ پیشن گوئی کی تھی۔

''غزل میں جذباتی رشتہ زیادہ ہوتا ہے۔ بیانیہ نہیں آج کل ہیئت کے بارے میں بہت بحث ہو رہی ہے اس پہ زیادہ زور دیا جا رہا ہے کہ نئے تجربے ہونا چاہئے مگر ہیئت کے معنی صرف ڈھانچے کے نہیں ہوتے۔ ہیئت میں صوتی آہنگ الفاظ ترکیبیں اور بہت سی چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ اندرونی طور پر ہم غزل کی ہیئت کو متاثر ڈھنگ کر سکے ہیں اور یہ موضوع میں تبدیلی ہوگی اور جب موضوع بدلے گا تو کہنے کا ڈھنگ الفاظ آہنگ بھی بدل جائے گا''۔ [۲]

جان نثار اختر کو شاعری کا ذوق ورثہ میں ملا تھا لیکن یہ ورثہ قدامتی رنگ میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ جان نثار کی طباعی اور فطرت اس کی متحمل نہیں تھی۔ جان نثار اختر نے اس رنگ کو

---

[۱] خیمہ گل از محمد علی تاج پیش لفظ جاں نثار اختر ص ۶

[۲] روزنامہ افکار بھوپال ص ۴ ۲۰ نومبر ۱۹۵۴ء

اختیار کرنے بجائے شاعری کا وہ اسلوب و رنگ اختیار کیا جو حقیقی فطری اور پائدار ہو۔ ان کی نگاہ تجس نے اپنے لئے شاعری کا وہ میدان مختص کیا۔ جس کا رشتہ ترقی پسند تحریک سے جڑا ہوا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا تھا۔ آخر اس راہ میں قدم رکھ کر انھوں نے غزل گوئی سے توجہ ہٹا کر اپنا رخ نظم کی طرف موڑ لیا۔ اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ انھوں نے غزل کے وسیلے کو اپنے ابلتے ہوئے دلی جذبات کے بہاؤ کے لئے ناکافی سمجھا۔ یہی نہیں بلکہ اپنی اب تک کی غزلوں کو اپنی شاعری ہی سے خارج کر دیا، چنانچہ ان کے پہلے مجموعہ کلام ''سلاسل'' میں ان کی کوئی غزل شامل نہیں ہے۔ دوسری تصنیف ''تار گریباں'' میں صرف تین ہی غزلیں جگہ پا سکی ہیں ''جاوداں'' میں تیرہ اور نذر تیاں'' یعنی چوتھے مجموعہ کلام میں صرف سات غزلوں کو شامل کیا ہے یعنی کل ملا کر صرف تیئس (۲۳) غزلیں ان کے چار مجموعوں میں نظر آتی ہیں۔ اس تشدیع سے اندازہ ہوتا ہے کہ جاں نثار اختر سرے سے غزل کے مخالف نہیں تھے وہ حرف عصری تقاضوں سے مجبور ہو کر ایک نمایاں تبدیلی چاہتے تھے چنانچے رواج زمانہ کے لحاظ سے موزونی طبع ہے۔ محض تکمیل دیوان کی خاطر صنف غزل کو بھی اس کا حق ادا کرتے رہے ان کے والد مصطفٰر خیر آبادی نے سات سال کی عمر میں اپنی پہلی غزل مکمل کی تھی جبکہ جاں نثار نے پہلی غزل تیرہ سال کی عمر میں کہی۔ اس کے غزل گوئی کا سلسلہ جاری رہا۔ ان کی ان ابتدائی غزلوں میں حالانکہ اپنے والد کی طرح رنگین اور وارفتگی کی فضا موجود تھی ساتھ ہی میں اس میں کہنہ مشق اساتذہ کی تقلید کا رنگ بھی گہرا تھا جو اس دور کے شعرا کا وصف خاص تھا یہ سب بھی ہوسکتا ہے کہ جسکی بنا پر انھوں نے ان تمام غزلوں کو اپنے دیوان سے خارج کر دیا تھا۔ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۴ء کی غزلوں میں (ابتدائے دور شاعری) ان کے چند شہبیہ غزلیں بھی ہیں

اس دور کے رنگ کا اندازہ کرنے کے خیال سے چند اشعار ان کی مختلف غزلوں سے ملاحظہ کیجئے۔

دور کوئی رات بھر گاتا رہا

تیرا ملنا مجھ کو یاد آتا رہا

اس طرح کچھ اس نے چھیڑا دل کا ساز

دیر تک ہر تار تھرآتا رہا

ہم نہ آئے پھر چمن میں لوٹ کر

موسم گل بار بار آتا رہا

اور طویل میں یہ اشعار دیکھئے۔

جب چاند کی کرنوں سے روشن دریا کے کنارے ہوتے ہیں

بھیگے ہوئے ذرے ساحل کے کیا چاند ستارے ہوتے ہیں

کیا کہئے کیا کیا بادل سے بجلی کے اشارے ہوتے ہیں

وہ بال بکھیرے جب میرے بازو کے سہارے ہوتے ہیں۔

جی جلائے ڈالتی ہے باغ میں لالے کی سیر

ایسا نازک پھول اور لپٹا ہوا شعلے میں ہے

محویت دید کی بڑھتی ہے تو جی ڈرتا ہے

تیری صورت میرے نظروں سے نہ پنہاں ہوجائے

جان نثار اختر کی ان غزلوں میں جو جذباتی گہرائی فنی اعتدال اور نغمگی رچاؤ اور رس ہے وہ جاں نثار اختر کے اندر چھپے ہوئے ایک فنکار کا پتہ دیتی ہے۔

غزل کا فن ہندوستان کی تہذیبی اور تمدن روایت سے لگاؤ جاں نثار کو ورثے میں ملا تھا۔ سچ بات یہ ہے کہ وہ دوسرے ترقی پسند شعراء کی طرح غزل سے کوئی بغض وکدورت نہیں رکھتے۔ بلکہ وہ اسے ضروری گردانتے اور اس کی ترقی کی خواہاں ہیں غزل کی اصلیت جاں نثار کے اندر کیا ہے ملاخط کیجئے۔

ہم سے پوچھو کہ غزل کیا ہے غزل کا فن کیا

چند لفظوں میں کوئی آگ چھپا دی جائے

جاں نثار نے اپنے آخری دور میں ایک بار پھر بھی غزل کی طرف اپنی توجہ مبذول کر کے متعدد غزلیں کہیں جو مختلف رسایل میں شائع ہوتی رہیں اور خیمہ میں بھی شامل کی گئیں۔ ان کی غزلوں میں ایک تحیّر زا طرز بیان۔ متناسب لب ولہجہ نظر آتا ہے محسوس ہوتا ہے کہ جدید دور کے تازہ ترین رجحانات ان پر اثر پذیر ہوئے ہیں ندرت بیان۔ تراکیب کا حسن۔ صداقت، سادگی،

شگفتگی روانی اور نغمگی اور جدید مسائل حیات ان کی غزلوں کے ایسے اوصاف ہیں جس کی بنا پر جاں نثار کی غزل کو حسن صورت اور حسن سیرت دونوں ہی عطا ہوئے ہیں اس صداقت کو پرکھنے کے لئے یہ چند اشعار دیکھئے۔

کس غریب دل سے غم عشق کا اشارہ
میری زندگی کو مجھ پر یہ ستم بھی تھا گوارا

برف مسینوں کی نہ پگھلے تو ہی رود حیات
جوئے کہ آب کی مانند سمٹ جاتی ہے

خودبخود نیند سی آنکھوں میں گھلی جاتی ہے
مہکی مہکی ہے شب غم تیرے بالوں کی طرح

شوخی پہ بھی احتیاط اتنی
چھولے جو نظر بدن چرالے
ہم دل کو کہاں تک سنبھالیں
دل بھی تو کبھی ہمیں سنبھالے

جاں نثار کی غزلوں میں ایسے اشعار بھی نظر آ جاتے ہیں جن میں حالانکہ کوئی ندرت ۔ یا تنوع ہے پھر بھی سادگی بیان اور سلاست وسادگی سے معمور زبان اور محبت کی وہ خاص کیفیات جس کو بیان کرنے پر شخص قادر نہیں ہو پاتا جان نثار جب ان کو گویائی عطا کرتے ہیں تو ایسے اشعار میں ڈھل جاتے جو دل کو موہ لیتے ہیں۔

ہائے وہ راتوں کی دہری چاندنی
وہ جمال دوست وہ ماہ تمام
دو دلوں کا وہ تصادم ہائے ہائے
جیسے میخانے میں ٹکراتے ہوں جام

صبح کی آس کسی لمحہ جو گھٹ جاتی ہے
زندگی سہم کے خوابوں سے لپٹ جاتی ہے
شام ڈھلتے ہی تیرا درد چمک اٹھتا ہے
تیرگی دور تلک رات کی چھٹ جاتی ہے

تیرے بن رات کے ہاتوں میں یہ تاروں کے ایاغ
خوبصورت ہیں مگر زہر کے پیالوں کی طرح

زندگی جس کی ترا پیار ملا وہ جانے

ہم تو ناکام رہے چاہنے والوں کی طرح

آزار میں لذت ہر عاشق صادق کا وطیرہ رہا ہے غالبؔ نے بھی آزار میں لذت محسوس کی تھی۔ اور وہ اسے برقرار رکھ کر ہی دکھ میں بھی سکھ تلاش کر ہی لیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں

دل خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر

اور جان نثار اختر کہتے ہیں۔

کون کہتا ہے تجھے میں نے بھلا رکھا ہے

تیری یادوں کے کلیجے سے لگا رکھا ہے

دیکھ جا آ کے مہکتے ہوئے گلشن کی بہار

میں نے اب تک تیرے گلشن کو سجا رکھا ہے

اور کیا اس سے زیادہ کوئی نرمی برتوں

دل کے زخموں کو چھوا ہے ترے گالوں کی طرح

جان نثار اختر کے غزلیہ اشعار میں قدیم اساتذہ سخن کی جھلک میں نظر آتی ہے۔ میؔر کا یہ پرتو جان نثار کے اشعار میں ملاحظ کیجئے۔

عشق میں نقصان نفع ہے ہم کو کیا سمجھاتے ہو
ہم نے ساری عمر ہی یارو دل کا کاروبار کیا

تجھے قسم ہے تری پرجمال باہنوں کی
گلے کے واسطے خنجر لئے ہوئے آجا

کچھ جرم نہیں عشق جو دنیا سے چھپائیں
ہم نے تمھیں چاہا ہے ہزاروں میں کہیں گے

اخؔتر کی شاعری میں احساس اور وقوف احساس کی بھی کارفرمائیاں بدرجہ اتم نظر آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے ان کے کلام میں معنی آفرینی کے ساتھ جذب و کیف حلاوت کی بہتات ہے۔ اس کے دوش بدوش وہ وارفتگی افتادگی اور والہانہ پن بھی دائرہ سائر جو محبت کا لازمی نتیجہ اور غزل کی روح سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

صبح نہائے جو جوڑا کھولے بانک بدن سے آ لپٹیں
اس کی رنگت اس کی خوشبو کتنی ملتی صندل میں

دیکھوں ترے ہاتھوں کو تو لگتا ہے تیرے ہاتھ
مندر میں فقط دیپ جلانے کے لیے ہیں

وہ چشمۂ حسنِ نوجوانی
انگڑائی جو لے فضا نہالے
زندگی کیا ہے مسلسل شوق بہم اضطراب
ہر قدم پہلے قدم سے تیز تر رکھتا ہوں میں

آختر کی غزلوں میں احساس قومیت، آفاقیت انسانی کلچر اور تہذیب کے اذکار کے ساتھ رومان پرور فضاؤں کا حسین جمگھٹا نظر آتا ہے۔

ساز بے حراب و مضراب نظر آتے ہیں
پھر بھی نغمے ہیں کہ بیتاب نظر آتے ہیں
کیا غضب ہے کہ غنچے تو ہیں پژمردہ زرد
خار آسودہ و شاداب نظر آتے ہیں

سمندر کو یقیں آئے گا کس دن

کہ ساحل سے بھی اٹھ سکتے ہیں طوفان
یہ گل بھی زخم یہ شبنم بھی آنسو
مجھے دھوکا نہ دے فصلِ بہاراں

جانے کس لمحہ دمک اٹھے فضائے کائنات
کوئی چٹکی میں لئے ہے دیر سے طرف نقاب
خورشید پہ بڑھ کے ہاتھ رکھدے
کاندھے پر زمین کو اٹھالے
یاں خبردارکی اک لغزش پائے کبھی
ساری تاریخ کی رفتار پلٹ جاتی ہے
اور تو کیا ملا مجھکو میری محنت کا صلہ
چند سکّے ہیں میرے ہاتھ میں چھالوں کی طرح

جان نثار اختر کا یہ خاص وصف ہے کہ وہ عزم جواُن کا دامن تھام کر ہی تحریک عمل دیتے ہیں وہ امید رکھتے ہیں کہ ایسی صبح ضرور آئے گی جب سورج افق پر نور افشانی کرتا ہوا دعوت شاد کامی اور حیات تازہ کا مژدہ لے کر آئے گا۔ وہ قنوطی نہیں اور نہ تھک کر بیٹھ جانے کے حق میں ہیں۔ وہ عمل کو ہی کلید کامرانی گرداتنے اور اسی کی بات کرتے ہیں۔ ملاخطہ ہو

انھیں گلرنگ دریچوں سے سحر جھانکے گی
کیوں نہ کھلتے ہوئے زخموں کو دعا دی جائے

رات رستے سے ہٹے بھی
صبح آنے کو کھڑی ہے

اور رات غفلتوں بھری زندگی کی رات ہے۔ جس کا احساس نہیں کہ آنکھ کھولتے ہی دنیا روشن ہو سکتی ہے اور اس طرح بھی آگاہ کرتے ہیں۔

فرصت کار فقط چار گھڑی ہے یارو
یہ نہ سوچو کہ ابھی عمر پڑی ہے یارو
اپنے تاریک مکانوں سے تو باہر جھانکو
زندگی شمع لئے در پہ کھڑی ہے یارو
ہم نے صدیوں انھیں ذروں سے محبت کی ہے
چاند تاروں سے تو کل آنکھ لڑی ہے یارو
فاصلہ چند قدم کا ہے منا لیں چل کر
صبح آئی مگر دور کھڑی ہے یارو
جب بھی چاہیں گے زمانے کو بدل ڈالیں گے

صرف کہنے کے لئے بات بڑی ہے یارو

یہی عزم اور حوصلہ کی باتیں ان کی اکثر غزلوں کا مزاج بن چکتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کچھ درد کو بانٹتا چل
ہر درد کو دل میں مت چھپا لے
خورشید پہ بڑھ کے ہاتھ رکھدے
کاندھے پہ زمین کو اٹھا لے

پاؤں اتنے تیز اٹھتے ہیں نظر آتے نہیں
آج تھک کر رہ گیا ہے آدمی یہ مت کہو
دل میں اپنے درد کی چھٹکی ہوئی چاندنی
ہر طرف چھائی ہوئی تیرگی یہ مت کہو

ہم نے ان تند ہواؤں میں جلائے ہیں چراغ
جن ہواؤں نے الٹ دی ہیں بساطیں اکثر
کسی کو پتہ ہے کون سے لمحے کون سا طوفان جا اٹھے

جانے کتنی درد کی صدیاں گونج رہی ہے پل پل میں

اردو شاعری میں عورت کا تاثر بصورت محبوبہ، دوست معشوقہ اکثر اظہار رومان کے طور پر تو ہے مگر اس کا شریک حیات ہونے کا تصور نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔ زن وشوہر کے باہمی تعلقات شاعری کے لیے بہترین موضوعات دے سکتا ہے جان نثار اختر نے گھر آنگن کے ذریعے نیا موضوع سخن۔ نیا تصور اور نیا تجربہ کر کے مسرت کا ایک نیا سرچشمہ تلاش کیا ہے۔

آتے کیا کیا یاد نظر جب پڑتی ان دالانوں پر
اس کا کاغذ چپکا دینا گھر کے روشن دانوں پر
آج بھی جیسے شانوں پر تم ہاتھ مرے رکھ دیتی ہو
چلتے چلتے رک جاتا ہوں ساڑی کے دوکانوں پر
اس کا کیا میں بھید بتاؤں اس کا کیا انداز کہوں
بات بھی میری سننا چاہے ہاتھ بھی رکھے کانوں پر
کھڑکی کی باریک جھری ہے کون یہ مجھ تک آجائے
جسم چرائے نین جھکائے خوشبو باندھے آنچل میں
گوری اس سنسار میں مجھ کو ایسا تیرا روپ لگے
جیسے کوئی دیپ جلا ہو گھور اندھیرے جنگل میں

بنا دیئے تھے کبھی کچھ غلط سلط قصے

وہ آج تک ہیں اس طرح بدگماں مجھ سے

پیش کردہ اشعار سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ بیوی کو گھر میں رہ کر بھی کیا جفالیت اور مرکزیت انجام دینا ہوتی ہے۔ اور اپنے شوہر کا کن کن جتنوں سے خیر مقدم کے لئے ہموار کرتی رہتی ہے۔ ان اشعار میں زندگی کی آمیٹ سچائیاں درون خانہ کے مناظر اور ان کے دلفریبیاں نفیسات کی باریکیاں اور کیف مستی میں ڈوبا ہوا رومان دیکھا جا سکتا ہے۔ میرے نزدیک شاعر نے شاعری کو زندگی سے ہم آغوش کر کے واقعیت کے جو گل کھلائے ہیں ان کی بھرپائی اور خوشبوں ہمیشہ سے معطر رکھے گی۔ جان نثار اختر انھیں باپ کے فرزند رشید نے جنھوں نے اپنے دور میں ہندی شاعری میں اپنا مقام بنالیا تھا۔ مضطر کے ان گیتوں کی گونج آج بھی اپنا سرنگار رس گھولتی گلیوں میں سنائی دیتی رہی۔

چھائے رہی ہے کالی گھٹا

جیا مورا لہرائے ہے

سن ری کویل باوری

تو کیوں ملہارا گائے ہے

(مضطر خیر آبادی)

ہندی شاعری کے اس رس کو اختر نے یقین کے گہوارے میں ہی اپنے کانوں میں گھلتا ہوا

محسوس کیا ہوگا جو آگے چل کر ان کے مزاج میں حلول کر گیا۔ ان کا یہ کہنا کسی قدر حق بہ بجانب ہے کہ..

"جو شخص ہندوستان میں پیدا ہو کر ہندی شاعری سے متاثر نہیں
ہوتا اس کا احساس شاعری مردہ ہے.........ہندی شاعری کے جذباتی
ہونے میں کس کا نام ہوسکتا ہے۔" [1]

حالانکہ جان نثار اختر نے ہندی شاعری پر مشتمل کوئی الگ سے دیوان ترتیب نہیں دیا تھا۔ پھر بھی ہندی الفاظ کو اپنے اشعار میں نگینے کی طرح جڑ کر نہ صرف یہ کہ اپنے اشعار کی شوبھا بڑھائی ہے بلکہ ہندوستان کی تمدن کی بھرپور جھلک بھی دکھائی ہے۔ انھوں نے سہل الفہم ہندی الفاظ کو اپنے بعض اشعار میں شامل کر کے شعر کو نئی معنویت دیکر اس کے امکانات کے نئی جہت دی ہے۔ یہ اشعار دیکھئے۔

ایک تو نیناں کجرارے اور تس پر ڈولے کاجل میں
بجلی کی بڑھ جائے چمک کچھ اور بھی گہرے بادل میں
آج ذرا للچائی نظر سے اس کو کیا بس دیکھ لیا
پگ پگ اس کے دل کی دھڑکن اتری آئے پایل میں

پیاسے پیاسے نیناں اس کے جانے پگلی چاہے کیا
تٹ پر جب جاوے سوچے ندیا بھرے چھاگل میں

---

[1] مضطر ہندی شاعری کی حیثیت سے از جاں نثار اختر علیگڈھ میگزین ۱۹۳۱ء ص ۳۷ تا ۴۰

چاند کی پتلی نوک پہ جیسے کوئی بادل اٹک جائے
ایسے اس کا گرتا پلو اٹکے آڑی ہیکل میں

برکھا کی تو بات ہی چھوڑو چنچل ہے پروائی بھی
جانے کس کا سبز دوپٹہ پھینک گئی ہے دھانوں پر
اس کا کیا من بھید بتاؤں اس کا کیا انداز کہوں
بات بھی مری سننا چاہے ہاتھ بھی رکھے کانوں پر

اجڑی اجڑی ہوئی ہر آس لگے
زندگی رام کا بن باس لگے

اک ایک لہر کسی یگ کی کتھا
مجھ کو گنگا کوئی اتہاس لگے
تو کہ بہتی ہوئی ندیا کی سمان
تجھ کو دیکھوں تو مجھ کو پیاس لگے

دم سادھ لیا کرے ہیں تاروں کی مدھر راگ
جب رات گئے تیرا بدن بات کرے ہے

ان اشعار سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ جاں نثار اختر کو ہندی الفاظ سے اپنے کلام کو رنگین بنانے کا ہنر خوب آتا تھا۔ ان کی جو بھی کوشش یا تجربہ ہے دل کے جذبات کا امنڈتا ہوا لاوا ہے جس نے زبان شاعر ہو کر شعر کا روپ دھار لیا ہے۔ ان اشعار کا بے ساختگی اور والہانہ پن اس امر کی غماز ہے کہ آخر کا کلام آمد ہی لئے ہوئے ہے۔ اس میں کوشش ارادی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ ہجر و فراق کے افکار سے اردو شاعری کا دامن بھرا پڑا ہے۔ بالخصوص اور غزل کی بنیاد عشق محبت کی داستان اور ہجر و فراق کا ماحصل درد و تڑپ پر مبنی ہے۔ اردو شاعر نے اس غم کو اپنے شعروں میں ابھار کر نہ یہ کہ اپنے لئے اسباب گریہ فراہم کیا ہے بلکہ اپنے قاری اور سامع کی آنکھوں کو بھی پرنم کر گیا ہے۔ بعض کے یہاں تو محض روایت پرستی کی دھن کا احساس ہوتا ہے۔ ایسے موقوں پر جذبات فطرت کے ابال کا احساس ثابت ہو کر اس کی لے بناوٹی اور اشعار بے اثر ہو جاتے ہیں۔ ایسی تصنع آمیز شاعری صرف سامان مضحکہ خیز ہی بہم پہونچاتی ہے۔ ہجر و فراق کے درد یا وصل کی سرخوشی انھیں کو زیب دیتی ہیں جنھوں نے محبت کا تیر اپنے دل وجگر پر کھایا ہے۔ اس حال کی کسک محض نقالی میں کہاں نظر آسکتی ہے۔ جاں نثار اختر کی شاعری میں ہجر کے صدمات کا ذکر کرتے ہوئے وہ اپنی مجبوری کا راگ نہیں الاپتے بلکہ زندگی کے رنگین لمحات میں ایسے صدمات کو دفن کر دینے کا جادو جگاتے ہیں۔ زندگی کو یہی حسین لمحات اور ان کی یادان کربناک اور تاریک نہانوں کو روشنی کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ محبوب کے رخسار کے گلاب کے ترشے ہوئے ہیرے کی طرح لوچ دار جسم اور ان کا حسین تصور اب بھی ان کی آنکھوں میں رنگین خواب کی طرح رچا بسا ہے۔ گلاب کی پنکھڑی جیسے نازک لب ناگن سی بل کھاتی زلفیں، گوری کلائیاں۔ ہاتھوں میں رنگ حنائی، اور ڈوپٹہ سے چھن چھن کر ملنے والا شربت دیدار۔

تقویٰ شکن بے ساختہ انگڑائیاں غرضکہ گزرے ہوئے رنگین لمحات کا ایسا خوبصورت البم ان کی نگاہ میں ہے جس میں وہ ہر غم سے بے نیاز ڈوبے ہوئے ہیں۔ اور ماضی کی یہی حسین یادیں ان کا سرمایہ حیات ہیں۔ جس کی بدولت وہ غرق نشاط ہیں۔ جس کا انھوں نے ایک جملے میں یوں اعتراف بھی کیا ہے۔

''یہی یادوں کی روشنی تو ہے آج جس روشنی سے میں زندہ ہوں''

اس کے علاوہ ان کے یہاں ایسے اشعار بکثرت ہیں جن میں وہ اپنے جواُن لمحات کی دنیا میں کھوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ملاخطہ ہوں

تری زلفیں تری آنکھیں ترے ابرو ترے لب
اب بھی مشہور ہیں دنیا میں مثالوں کی طرح
ہم سے مایوس نہ ہو اے غم دوراں کی ابھی
دل میں کچھ درد چمکتے ہیں اجالوں کی طرح

کون کہتا ہے تجھے میں نے بھلا رکھا ہے
تیری یادوں کو کلیجے سے لگا رکھا ہے
تونے جو دل کے اندھیرے میں جلایا تھا کبھی
وہ دیا آج بھی سینے میں جلا رکھا ہے

ہائے وہ اک رات ساحل راگنی مہتاب تم
بن گئے میرے لیے کیسا سہانا خواب تم
میری خاموشی پہ جب تم رو دیئے ہو بارہا
لاؤ گے کس دل سے میرے آنسوؤں کی تاب تم
آج ان کو زخمۂ غم بھی جگا سکتا نہیں
چھیڑتے رہتے تھے جن تاروں کو بے مضراب تم

ہم نے کاٹی ہیں تیرے یاد میں راتیں اکثر
دل سے گذری ہے چراغوں کی براتیں اکثر
اور تو کون ہے جو مجھکو تسلی دے گا
ہاتھ رکھ لیتی ہیں دل پر تری یادیں اکثر

آہٹیں کون سی خوابوں میں بسی ہیں جانے
آج بھی رات گئے نیند اچٹ جاتی ہے

لمحے لمحے میں بسی ہے تیری یادوں کی مہک
آج کی رات تو خوشبو کا سفر لگتی ہے

کیا سوچ ہے میں رات کو کیوں جاگ رہا ہوں
یہ کون ہے جو مجھ سے سوالات کرے ہے

ہر ایک رات نشے میں تیرے جوبن کا خیال
نہ جانے ٹوٹ گئیں کئے صراحیائیاں ہم سے

اگر چہ جان نثار اختر کی زندگی کبھی تمناؤں سے ہم آہنگ نہ ہوسکی پھر بھی وہ تھک ہار کر نہیں بیٹھتے اور جہد و پیکار حیات کو ہی اپنا اشعار بناتے رہے۔

سمجھ سکے تو سمجھ زندگی کی الجھن کو
سوال اتنے نہیں ہیں جواب جتنے ہیں

زندگی جسکو ترا پیار ملا وہ جانے
ہم تو ناکام رہے چاہنے والوں کی طرح

زندگی یہ تو نہیں تجھکو سنوارا ہی نہ ہو
کچھ نہ کچھ ہم نے تیرا قرض اتارا ہی نہ ہو

صبح کی آس کسی لمحہ جو گھٹ جاتی ہے
زندگی سہم کے خوابوں سے لپٹ جاتی ہے

ہم ان تند ہواؤں میں جلائے ہیں چراغ
جن ہواؤں نے الٹ دی ہیں بساطیں اکثر

جیسا کی عرض کیا جا چکا ہے ترقی پسند تحریک میں اندرونی انتشار کے بعد جان نثار اختر کا اعتقاد عملی سیاست سے اٹھ گیا تھا پھر ان کے دل میں یہ جذبہ ہمیشہ تلاطم پیدا کیے رہا کی کسی طرح دنیا میں امن و عافیت کا دل بالا ہو اور انسان اطمینان کی سانس لے سکے ان کی شاعری کا یہ نمایاں وصف ہے کہ اس میں تقلید کے بجائے حقیقت نگاری اور عجبیت کے بجائے ملکی عناصر کی کثرت ہوتی ہے۔ وہ اپنے کلام میں وطن عزیز کے فطری مناظر۔ تمدن تہذیب، و معاشرت کے مدح سرا ہیں۔ آزادی انسان کا فطری حق ہے جو اسے ملنا ہی چاہیئے۔'' یہ ان کا نصب العین ہے۔ نظموں کے علاوہ ان کی غزلیں بھی انھیں اوصاف متصف ہیں۔ یہ اشعار دکھئے ان میں عصر حاضر کی کس قدر تلخ سچائی جھلکتی ہے۔

کٹ سکی ہیں اب تلک سونے کی زنجیریں کہیں
آج ہم آزاد ہیں یارو ابھی یہ مت کہو

وطن سے عشق غریبی سے بیر امن سے پیار
سبھی نے اوڑھ رکھے ہیں نقاب جتنے ہیں

کوئی آسودہ نہیں اہل سیاست کے سوا
یہ صدی دشمن ارباب ہند لگتی ہے

انقلابوں کی گھڑی ہے
پر نہیں ہاں سے بڑی ہے
لوگ خاموش سے کیوں ہیں
ایسی کیا آن پڑی ہے

فریاد ہے اے غم زمانہ
لوگوں نے ضمیر بیچ ڈالے

جب بھی چاہیں گے زمانے کو بدل ڈالیں گے
صرف کہنے کے لیے بات بڑی ہے یارو
شرم آتی ہے کہ اس شہر میں ہم ہیں کہ جہاں
نہ ملے بھیک تو لاکھوں کا گذارا ہی نہ ہو

شہر کے تپتے فٹ پاتھوں پر گاؤں کے موسم ساتھ چلیں
بوڑھے برگد ہاتھ سا رکھ دیں میرے جلتے شانوں پر
غربت جیسی غربت یارو غربت کا کیا حال لکھیں
جانے کتنے خون ہوئے کچھ پیسوں پر کچھ آنوں پر

ہاں خبر دار اک لغزش پا سے کبھی
سارے تاریخ کی رفتار پلٹ جاتی ہے

ہم نے انسانوں کے دکھ درد کا حل ڈھونڈھ لیا
کیا برا ہے کہ یہ افواہ اڑا دی جائے

حالانکہ جان نثار اختر کا میدان شاعری غزل نہیں ہے بلکہ وہ بنیادی طور سے غزل کے شاعر ہیں پھر بھی انھوں نے جو بھی اور جتنی غزلیں کہیں ہیں اس میں پوری طرح اپنے فن اور صلاحیتوں کا جلوہ جگایا ہے۔ ان کا عشق ماورائی نہیں مجازی ہے ان کا محبوب اسی زمین سے تعلق رکھتا ہے وہ زمین پر رکھ کر زمین کے مسائل سے محبت کرتے اور اسی دھرتی کا لیکن اپنے محبوب کا گن بھی گائے ہیں اور اس کی باتیں کرتے ہیں۔

اے وہ تسلیم و محبت کی ادا

اے وہ شرمایا ہوا ان کا سلام

ہائے وہ راتوں کی دہری چاندنی

وہ جمال دوست وہ ماہ تمام

دو دلوں کا وہ تصادم ہائے ہائے

جیسے میخانے میں ٹکراتے ہوں جام

میری خاموشی پہ جب تم رو دیے ہو بارہا

لاؤ گے کس دل سے میرے آنسوؤں کی تاب تم

ان وفا کی بستوں کو اس جنوں کے دیس کو

آج بھی نایاب ہو تم آج بھی نایاب ہم

اختر اردو غزل کی قدیم روایات کے مخالف ہیں ان کے نزدیک یہ فطری انداز ءاظہار نہیں ہوسکتا کیونکہ "جب لگیں زخم تو قاتل کا دعا دی جائے" یہ امر فطری ہیں ہے اس لیے وہ پرزور طرح سے مشورہ دیتے ہیں اگر یہ رسم ہے تو یہ رسم اٹھا دینے کی ضرورت ہے۔ یہ ناممکن العمل ہے۔ اختر کے محبوب کے سینے میں انسان کا دل ہے وہ انسان کی طرح سوچتا ہے وہ ہجر سے بے قرار اور وصل سے شاد ہوتا ہے۔ اسکی بے کلی فطری اور دل کی تڑپ اور آرزو اپنے اصلی رنگ و آہنگ میں جلوہ گر ہوتی۔ اس لیے اس سے لگاؤ کا احساس ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنی

طرح جیتا جاگتا انسان ہے اس تناظر میں جان نثار کا یہ تخاطب ملاحظہ ہو۔

ہائے وہ اک رات ساحل راگنی مہتاب تم
بن گئے میرے لیے کیسا سہانا خواب تم
تم جو اٹھے جھلملا اٹھے ستاروں کے چراغ
لوٹ کر کیوں لے حسن شب مہتاب تم

رہی ہیں داد طلب ان کی شوخیاں ہم سے
ادا شناس بہت ہیں مگر کہاں ہم سے
ہمیں کو ذوق نظارہ نہیں رہا ورنہ
اشارہ آج بھی کرتی ہیں کھڑکیاں ہم سے

تم بھی مجرم ہو فقط میں ہی گنہ گار نہیں
میں یہ کہتا ہوں کہ دونوں کی سزا دی جائے

تم بھی اس دل کو دکھالو تو کوئی بات نہیں
اپنا دل آپ دکھایا بہت دن ہم نے

ہم سے بھاگا نہ کرو دور غزالوں کی طرح

ہم نے چاہا ہے تمھیں چاہنے والوں کی طرح

گنگناتے ہوئے در آ کبھی ان سینوں میں

تیرے خاطر جو مہکتے ہیں شوالوں کی طرح

جاں نثار اختر کی غزل حسن وعشق کی رنگین داستان ہے اس میں حیات انسان کے تمام نشیب وفراز خوبیاں اور خامیاں ہیں جو ایک دہی اور فطری شاعری کے لئے لازم ہیں۔ جاں نثار نے اپنی نظم اور غزل دونوں میں اپنے لطیف اور نازک ترین احساسات کو شاندار خلوص اور شیریں، تغزل، دلفریب ترنم اور سبک۔ دلنشین آواز میں پیش کیا ہے۔ یہ کہ ان کی شاعری لائق قدر اسلوب اور سچے خیالات کا حسین امتزاج پیش کرتی ہے۔ اس لیے اس میں جذب اور اثر کی کمی نہیں۔ ان کی شاعری کی اساس فطری۔ پرخلوص اور واقعیت کے اظہار کا دامن تھام کر آگے بڑھتی ہے۔ ان لہجہ کے مدھم لے اور کھنک دلوں کو موہ لیتی ہے۔ جاں نثار نے پرانی علامات کو نیا روپ دینے کی سعی جمیل کی ہے اور اپنی ہنرمندی کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے اسے فرسودگی سے بچانے کی کوشش کی ہے۔ اقبال کے بعد جگرؔ، فراقؔ، فیضؔ اور جذبیؔ نے اردو غزل کو نئے اقدار اور نئے تقاضوں کی آواز دے کر اسے زمانہ کے دوش بدوش ہو کر چلنے اور اپنے ارتقائی کی منازل طے کرنے کی راہ سمجھاتی تھی۔ جاں نثار اختر نے انھیں تصورات کو لے کر پچھلے ادوار کے غزلوں کے برعکس اپنی غزلوں کی سماجی شعور جذبات دل کی سچی ترجمانی، فنی بلندی۔ علوئے فکر لطافت وسادگی خلوص وصداقت کے ملبوس میں سجا کر پیش کیا ہے اپنے آخری دور کی

غزلوں میں وہ جدیدیت سے متاثر محسوس ہوتے ہیں اور جدید اقدار و عزائم کا اس خوبی سے ذکر کرتے ہیں کہ ان کی آواز قاری کو اپنی آواز محسوس ہوتی ہے اسی لیے ان میں اثر آفرینی کا پرتو پوری طور پر جھلکتا ہے۔ اور لطف انبساط کی فضا پیدا کر کے سرشاری عطا کرتا ہے۔ یہی اچھی شاعری کی علامت اور اس کا تقاضا ہے اگر ان کے کلام کا یہ نمائر مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہے کہ ان کا رومان پرور دل اور شاعری اس "کافر صنف سخن" یعنی غزل کے ہی عبارت ہے جس سے انھوں نے بہت دنوں تک کنارہ کشی اختیار کی مگر دل کی آواز اور فطرت کے تقاضوں نے انھیں اس دام میں از سر نو لا کر کھڑا کیا ہے۔ جس میں وہ ہر طرح اپنے دل نشین اشعار کا جادو جگاتے نظر آئے ہیں۔ جاں نثار نے اپنی فنی کمالات اور ہنر مندی سے اس امر کا ثبوت فراہم کیا ہے کہ وہ صحیح معنوں میں الفاظ و معنی کے مزاج داں اور پوری طرح سے غزل کی مشاطگی کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ ان کی زندگی نے وفا نہیں کی ورنہ ان سے امیدیں وابستہ تھیں کہ وہ اپنے حسن تغزل سے غزل کو وہ بانکپن دے کر غزل کہ افراط و تفریط اور غیر فطری سے بچا کر غزل کی ایک نئی جوت جگا کر آئندہ کے لیے ایک پر نور راہ ہموار کر سکیں گے۔

جاں نثار اختر بحیثیت نظم نگار

نظم شاعری کی ایک ایسی صنف ہے جس میں کسی خیال واقعہ یا قصہ کو تسلسل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ نظم کا دائرہ کار بہت وسیع کیونکہ اسی میں ہیئت موضوع اور اشعار کی کوئی قید نہیں ہے۔ نظم کی تعریف کرتے ہوئے سید احتشام حسین رضوی رقمطراز ہیں

''جب نظم کا لفظ شاعری کی کسی خاص صنف کے لیے استعمام ہوتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے اشعار کا ایک مجموعہ جس میں ایک مرکزی خیال ہو اور ارتقائے خیال کی وجہ سے تسلسل کا احساس ہو۔ اس کے لیے کسی مخصوص موضوع کی قید نہیں اور نہ ان کی ہیئت ہی معین ہے'' [۱]

جہاں تک نظم گوئی کے ترجمان اور آغاز کا سوال ہے عموماً یہ غلط معروضہ سامنے آتا ہے کہ یہ بیسویں صدی عیسوی کی پیداوار ہے یا انگریزی تعلیم کے اثرات کی بنا پر اس کا وجود ہوا۔ لیکن تاریخ ادب اردو کے مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ قدیم یا کلاسیکل شاعری میں بیانیہ اصناف سخن کا رواج تھا۔ یہ درست ہے کہ با قاعدہ اس کا کوئی مخصوص نام نہیں وضع ہوا تھا جیسے افضل کا بارہ ماسہ یا بکٹ کہانی کو نظم کے زمرے میں شامل کیا جاتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ''اردو شاعری کی تاریخ ہی اردو نظم کی تاریخ ہے۔ تو شاید غلط نہ ہوگا۔ اس سلسلے میں خلیل الرحمٰن اعظمی مختصر لیکن جامع نقطوں میں لکھتے ہیں۔

''اردو شاعری کے ابتدائی دور سے لے کر ۱۸۰۷ء تک اور اس کے کچھ دنوں بعد تک ہمارے یہاں غزل سب سے زیادہ پسندیدہ ذریعہ اظہار رہی ہے شہر آشوب اور اس طرح کی دوسری اصناف نظم ہی

---

[۱] اردو شاعری کا فنی اور تاریخی ارتقاص ۱۳۹ اسید احتشام رضوی۔ نگار اصناف سخن نمبر ۱۹۵۷ء

کی ذیل میں آئی ہیں'' ۱؎

اردو شاعری کے ابتدائی سرمایہ میں نظم کے نقوش تلاش کیے جاسکتے ہیں جو صوفیوں ،سنتوں، باکمال بزرگوں جنھوں نے حق کی حمایت میں عارفانہ مضامین کی اشاعت واپنے تبلیغ مشن کے لیے مثنوی یا نظم کا ہی پیرایہ اختیار کیا تھا اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ولی دکنی نے غزلوں کے علاوہ رباعی قطعہ مخمس اور مثنوی میں بھی طبع آزمائی کی تھی۔ محمد حسین آزاد نے ولی کو پہلا نظم گو قرار دیتے ہوئے یوں اظہار خیال کیا ہے۔

''یہ نظم اردو کی نسل کا باوا آدم.........جب کشور وجود میں پہونچا تو ایوان شاعری کے صدر میں اس کا تخت جمایا.........اسی زمانے تک اردو میں متفرق شعر ہوتے تھے۔ ولی اللہ کی برکت نے اسے وہ زور بخشا کہ آج ہند کی شاعری نظم فارسی سے ایک قدم پیچھے نہیں ہے۔ تمام بحریں، فارسی میں اردو میں لائے ہیں ساتھ اس کے رباعی قطہ مخمس اور مثنوی کا رستہ بھی نکلا۔ انھیں ہندوستان کی نظم میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو انگریزی کی نظم چاسر کی شاعری کو اور فارسی میں رودکی کو اور عربی میں مہلل کو''۔ ۲؎

اسی زمانے میں جیسا کہ مذکور ہوا افضل کا بارہ ماسہ بھی منعۂ شیود پر آیا تھا جس کے بارے میں پروفیسر احتشام حسین رضوی لکھتے ہیں۔

''مثنوی کی بحریں میں ہوتے ہوئے بھی بارہ ماسہ مثنوی سے مختلف ہے'' ۳؎

۱؎ نئی نظم کا سفر ص ۱۴ پروفیسر خلیل الرحمٰن اعظمی ۲؎ آب حیات ص ۸۲ مولانا محمد حسین آزاد

۳؎ نگار ص ۱۲۳ مضمون نگار پروفیسر احتشام حسین رضوی جنوری فروری ۱۹۰۷ء

احتشام حسین رضوی صاحب کی اس روایت سے تصور یہ کہ بارہ ماسہ مثنوی ہے صحیح نہیں رہ جاتا۔ بلکہ اور ہی صنف ہے لہذا اس کو نظم کہنے میں کوئی قباحت نہیں۔ بہر حال مثنوی کی مقبولیت نے نظم کی راہ ہموار کی اور مثنوی کی یہی مختلف مشکل ایک باقاعدہ صنف سخن یعنی نظم کی صورت میں جلوہ گر ہوئی۔

شمالی ہند میں نظم کا آغاز جعفر زٹلی سے تسلیم کیا جاتا ہے جنھوں نے اپنی ہنر گوئی اور ہجو کے پرائے ہیں اپنے عہد کے سماج اور فضاؤں کے نوحہ رقم کیا اور ان حالات سے اپنا اظہار بیزاری بھی کیا۔ چونکہ ان کی شاعری ان کے عہد میں پھکڑ پن یا بیہودہ گوئی کی حد تک متہم تھی یہی وجہ ہے کہ ان کی نگارشات صرف بادہ گوئی یا۔ زٹل۔ یعنی بکواس بغس اور فضول بات۔ فضول بک جھک سمجھی جاتی تھی اسی لیے ان کے نام کے ساتھ زٹلی کا لاحقہ لگا کر سے ان کے نام بلکہ ان کی شناخت بن گیا۔ پھر اسی میں شک نہیں ان کے یہاں کچھ کام کی باتیں بھی نظر آ جاتی ہیں۔ مثلاً تلخ تجربات سے گذرتے ہوئے یہ جذبات ملاحظہ ہوں۔

گھوڑا جو سواری نہ دے
صاحب طلب ساری نہ دے
بیٹا وہ جو یاری نہ دے
ایں سرتن فی النار بد

جو رو لڑا کا گربود

پر خوف و ڈر آن گھر لود
آن گھر ہمہ ابتد لود
اس گھر سے گنگایار بہ

جعفر نے عہد مغلیہ کی زبوں حالی۔ اخلاقی زوال اور سماجی پستی کے موضوعات کی جز د شاعری بنایا ہے ان کی شاعری ہمارے عہد نظمیہ شاعری سے بڑی حد تک قریب نظر آتی ہے۔ جفر زٹلی کی شاعری کے بارے پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں۔

''ان کی شاعری اس عہد کی بہت سے خامیوں کی ترجمان ہے نوکری پر ایک نظم کے یہ شعر ملاخط ہوں۔

بشوقیاں نوکر جب گانٹھ ہووے کھو کھری
تب بھول جاوے چوکڑی یہ نوکری کا خبط ہے
یہ صبح ڈھونڈتے چاکری کوئی نہ پوچھتے بات ری
سب قوم ڈھونڈلاگری یہ نوکری خبط ہے

'' پروفیسر احتشام حسین رضوی کے اس قول سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف نے جعفر زٹلی کے ان اشعار کو نظم کی زمروت میں شمار کیا ہے۔ جعفر زٹلی کے علاوہ اس دور کی دہلی میں مبارک آبرو۔ شیخ فضاں اشرف الدین ممنون شاکر بانی غلام مصطفٰے۔ یکرنگ بعد کے ترانے

میں شاہ حاتم۔ اشرف علی خاں۔ سراج اور اس سے ملحق علی خاں آرزو۔ اور صدرالدین فائزہ وغیرہ کے بھی اپنے مفکرانہ شعور سے تجربات حیات غزل کے علاوہ طرز مثنوی کی صنف کو ہی اپنا وسیلہ اظہار بنایا تھا۔ ان کی شاعری میں دہلی کی سماجی کیفیات اور واقعات کا تسلسل سے ذکر ملتا ہے جس کو نظمیں ہی کہا جاسکتا ہے غرضکہ اسی دور میں اردو شاعری ہر صنف نے ارتقاء کی منزلیں طے کرنا شروع کردیں تھیں سودانے واسوخت۔ مخمس۔ ترجیع بند رباعیات اپنی اپنی طرز کے اعتبار سے لاجواب لکھیں میر تقی میر نے بھی مثنوی۔ ترکیب بند اور شکارنامے لکھے۔ اسی ساری تاریخ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے اسی دور تک شعرا اپنے دور کے ماضی حالات اور سماجی کیفیات کو پیش کرنے کے لیے ایک بیانیہ صنف سخن کی فکر میں تھے چنانچہ اسی زمانے میں قصیدہ اور شہر آشوب وغیرہ کی مقبولیت کا ہی سبب تھا۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قدیم شعرا کے کلام میں نظم کے ابتدائی نقوش ابھرنے لگے تھے۔ نظیر اکبرآبادی کو اردو نظم کا موجد کہا جاتا ہے۔ ان کا زبردست کارنامہ یہ ہے کہ انھوں حیات انسانی اور سماجی حالات کی ٹھوس سچائیوں کی طرف نگاہ کی اور انھیں مضامین کو اپنا وسیلہ اظہار بنایا۔ نظیر سے پہلے یقیناً اردو شاعری ذہنی اور محض خیالی تھی نظیر کی شاعری میں جیتا جاگتا انسان پہلی بار نظر آیا۔ نظیر نے ارادی طور سے ہندوستان کی رنگا رنگ گنگا جمنی تہذیب کی منظرکشی کو اپنی شاعری کا بنیادی موضوع بنایا۔ بلکہ اسی عہد کے شعرا صرف باطنی حقایق اور صرف النفس کی عکاسی کو ہی تقاضائے شعرگوئی تصور کرتے تھے آفاقی حقایق سے ان کا سروکار نہیں تھا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر افغان اللہ خان لکھتے ہیں۔

"نظم نگاری کی دنیا نظیر کے بعد اک مدت تک بے آواز رہی۔ نظیر اور جدید دور کے درمیان کوئی ایسا شاعر نظر نہیں آتا جس نے نظیر کی

روایت میں اضافہ تو خیر دور کی بات ہے اس سلسلے کو برقرار رکھا ہو۔ کھینچ تان کر افغان اللہ خاں کی ایک آدھ غزلیں اور غالب کی چکنی ڈلی کو نظم کا نام دے سکتے ہیں'' [1]

نظیر اکبرآبادی نے نظم گوئی کی جس روایت کو قائم کیا تھا۔ وہ غزل کے سامنے پروان نہ چڑھ سکی اور مسلسل غزل کا ہی طوطی بولتا رہا۔ ۱۸۵۷ء کے ناکام جنگ کے بعد جب انگریزوں کا تسلط قائم ہوگیا۔ اور ایک نئی تہذیب کا آغاز ہوا۔ انگریزی تعلیم کا رواج ہوا اور اسی کا ہندوستان کی ثانوی پر پڑنا شروع ہوا۔ انگریزی تعلیم نے آزادی خیال اور وسعت نظر کی ایک نئی روح ہندوستانیوں میں پھونکنا شروع کی۔ اسی زمانہ میں نظم نگاری کی باقاعدہ تحریک شروع کی گئی۔ جس کے لیے انجمن پنجاب کا قیام عمل میں آیا تھا۔ جس کے بانی محمد حسین آزاد اور حالؔی تھے۔ وطن کی زبوں حالی اور سیماب کی حالت مسلمانوں کے زوال اور دہلی کی تباہی کا ذکر کیا ہے۔

''بعقول ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی ۱۸۷۴ء سے ۱۹۲۰ء تک کی درمیانی مدت کی چونکہ دوسری اصناف سخن کی بہ نسبت نظمیں زیادہ لکھی گئی ہیں۔ اس لیے اس دور کو ہم نظم نگاری کا دور کہہ سکتے کو اس دور کے مشہور نظم گو بے نظیر شاہ محمد اسمائیل میرٹھی منیر شکوہ آبادی۔ احمد علی شوق قدوائی۔ برج نرائن چکبست، جوش ملیح آبادی۔ ڈاکٹر محمد اقبال۔ سیماب اکبر آبادی۔ وحید الدین سلیم۔ نظم طبا، طباعی افسر میرٹھی۔ احسان دانش اختر شبرانی حفیظ جالندھری۔ مجاز ردولوی۔ جان نثار اختر۔ اختر الایمان اور

---

[1] فراق کی شاعری ص۱۴۳ ڈاکٹر افغان اللہ خاں

جگت بن لال رواں وغیرہ ہیں۔'' [1]

بیسوی صدی کا آغاز سیاسی سماجی اور معاشرتی تبدیلیوں کا دور ہے یہ دور صرف ہندوستان کے لیے نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی تغیر اور تبدیلی کا زمانہ رہا ہے۔ زندگی کی نئی نئی حقیقتیں سامنے آئیں اور کلاسیکل رنگ تغزل سے شعوری طور پر انحراف کیا گیا۔ مختصر یہ کہ اسی دور کے شعرا پر حقیقت پسندی کا رنگ غالب رہا۔ اظہار کی آزادی اس دور کا خاص وصف ہے اسی دور میں شاعر کوئی فطرت پسند کوئی قومی اور ملکی رنگ کا رسیا کوئی رومانی شاعری کا پرستار کوئی زاہد خشک تو کوئی آزادی کا متوالا نظر آتا ہے۔ ایسے انقلابی شاعر بھی نظر آتے ہیں جنھوں نے نظموں کے ذریعہ غلامی کی زنجیریں توڑ کر آزادی حاصل کرنے کی ترغیب دی اور انقلاب اس دور کا سب سے زبردست قومی نعرہ قرار پایا پھر بھی قومی اور تہذیب مسائل پر بھی فکر انگیز شاعری کی گئی۔ اس دور کی شاعری کا ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ شاید ہی کوئی ایسی سماجی یا سیاسی تحریک ہو جس کا براہ راست اثر شاعری پر نہ نظر آتا ہو۔ بہر حال یہ زمانہ غم جانان کے مذکور کے بجائے غم دوران کی مقبولیت کا دور تھا۔ اور غزل کے بجائے بیشتر شعرا کا رجحان نظم کی طرف بڑھ گیا۔

جیسا کہ گذشتہ باب میں عرض کیا جا چکا ہے۔ جاں نثار اختر کو شاعری کا ذوق ورثے میں ملا تھا اور یہ کہ ان کے والد مضطر خیر آبادی بھی ایک مسلم الثبوت شاعر تھے جاں نثار اختر گھریلو ادبی شاعرانہ ماحول کی وجہ سے کلاسیکی رنگ تغزل اور فنی نزاکتوں سے ابتدا ہی سے آشنا ہو گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کام میں رومانیت اور کلاسیکیت دونوں کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ بقول آفاق حسین صدیقی۔

---

[1] جگت موہن لال رواں حیات اور ادبی خدمات ص ۲۰۴ ڈاکٹر ظفر قدوائی نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۸۴ء

''شعری لحاظ سے جاں نثار اختر کی شاعری نے کلاسیکیت کی آغوش میں آنکھیں کھولیں روایت کے سایہ میں ابتدائی نشوونما حاصل کی اور رومانیت کے زیر اری عنوان شباب تک پہونچے۔'' [۱]

جاں نثار اختر پر رومانیت کا یہ اثر علیگڈھ کے دوران ان کی ایک نظم ''گرلس کالج کا لاری'' میں نمایاں طور پر موجود ہے جوان کے مشاہدے جذبہ واحساس کا وجدآفریں نتیجہ ہے۔ نظم کے مطالعہ سے جاں نثار کی شاعرانہ صلاحیت اور ان کی تخلیقی توانائیوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ یہ نظم تمام تر محاکاتی انداز لیے ہوئے ہر منظر کو زندہ نگاہوں کے سامنے لاکر کھڑا کرتا ہے۔

اس نظم کے چند اشعار ملاخطہ کیجئے اور محسوس کیجئے کہ شاعر کی نگاہ سے کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ نظر بھی بوشیدہ نہیں ہے کالج کی لڑکیوں کا ذکر نہایت فطری اور دلچسپ ہے۔

کسی کی نظر میں محبت کے دوہے
''سکھی ری پیا بن یہ جیون نہ سوہے''
یہ کھڑکی کا رنگین شیشہ گرائے
وہ شیشے سے رنگین چہراہ ملائے
یہ چلتی زمیں پر نگاہیں جماتی
وہ ہونٹوں پہ اپنے قلم کو دیاتی
یہ کھڑکی سے ایک ہاتھ باہر نکالے

---

[۱] جان نثار اختر شخص اور شاعر ص ۲۸ آفاق حسین صدیقی

وہ رانوں پہ گرتی کتابیں سنبھالے
کسی کو وہ ہر بار تیوری سے چڑھتی
دوکانوں کے تختے ادھورے سے پڑھتی
وہ لاری میں گونجے ہوئے زمزے سے
دبی مسکراہٹ سبک قہقہے سے
وہ لہجوں میں چاندی کھنکتی ہوئی سی
وہ نظروں میں کلیاں چٹکتی ہوئی سی
سروں پہ وہ آنچل ڈھلکتے ہوئے سے
وہ شانوں پہ ساغر چھلکتے ہوئے سے
جوانی نگاہوں میں دہکی ہوئی سی
محبت تخیل میں بہکی ہوئی سی
وہ آپ کی چہلیں وہ جھوٹے فسانے
کوئی ان کی باتوں کو کیسے نہ مانے
فسانہ بھی ان کا ترانہ بھی ان کا
جوانی بھی ان کی زمانہ بھی ان کا

اس نظم کی مقبولیت کا اندازہ پروفیسر خلیل الرحمٰن اعظمی کے اس تجربے سے بخوبی ہوتا ہے

ملاخطہ کیجئے

''جان نثار اختر کی شاعری کا آغاز غزلوں اور ہلکی پھلکی نظموں سے ہوتا ہے ان کی ابتدائی نظموں میں ''گرلز کالج کی لاری'' کافی مقبول رہ چکی ہے۔ اور اس نوع کی عنفوان شباب کی نظمیں۔ ''

کبھی ریل میں گذر وگی فردوس علیگڈھ سے
تمھیں محسوس ہوگا رہ چکی ہو تم یہاں جیسے
تمھیں بے ساختہ میری محبت یاد آئے گی [۱]

ویسے تو جاں نثار اختر کی شاعری کی شروعات رومانی طرز کی نظموں اور غزلوں سے ہوا تھا۔ لیکن جلدی ہی ترقی پسند تحریک سے وابستگی نے انھیں سیاسی اور سماجی موضوعات کی طرف متوجہ کر دیا۔ اور انھوں نے اپنے اردگرد کی سماجی سچائیاں اور معاشرتی حقیقیں نظم کرنا شروع کر دیں۔ موضوعات ضرور بدل گئے تھے لیکن رومان پرور خاصہ ازلی کی جھلک رومانیت کی لے سے معموران کی اس طرح کی نظموں میں بھی دیکھی جاسکتی ہے جمالیاتی تصوران کی نظموں ''نذر انجم۔ موہوم افسانے۔ کون سا گیت سنو گی انجم۔ مزدورعورتیں، حسن آگ و پروانہ۔ بے خواب آنکھیں۔ یادوں کے چراغ۔ ماتم نشاط۔ چھاگل کی صدا وغیرہ میں پوری طرح سے جلوہ گر ہیں۔ چند رومانی غزلوں کے اقتسابات بطور نمونہ ازدارے ملاخط کے لیے پیش ہیں تا کہ ان کی شاعری کے خط وخال نمایاں ہو جائیں۔

---

[۱] اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک ص ۱۰۰ خلیل الرحمٰن اعظمی

میں تجھے چاہتا نہیں لیکن
پھر بھی جب پاس تو نہیں ہوتی
خود کو کتنا اداس پاتا ہوں
گم سے اپنے حواس پاتا ہوں
جانے کیا دھن سمائی رہتی ہے
اک خموشی سے چھائی رہتی ہے
میں تجھے چاہتا نہیں لیکن
پھر بھی رہ رہ کے میرے کانوں میں
گونجتی ہے تیری حسین آواز
جیسے نادیدہ کوئی بجتا تار
ہر صدا ناگوار سوتی ہے
دل کی دھڑکن بھی بار ہوتی ہے
اک سکوت آشنا ترانوں میں
میں تجھے چاہتا نہیں لیکن

(نظم تجریہ)

یہ تیری مہ جبیں یہ تیر بے خواب آنکھیں
چھاؤں میں چاندستاروں کی یہ پرآب آنکھیں
کھوئی کھوئی سی یہ مایوس نگاہیں تری
یہ تری سانس میں ٹوٹی ہوئی آہیں تیری

(نظم بے خواب آنکھیں)

کبھی چمن میں لطافت بھی بار گذری ہے
نظر پہ پھول کی رنگت بھی بار گذری ہے
مزہ ملا ہے کبھی خار کی کہانی میں
کبھی گلوں کا حکایت بھی بار گذری ہے

(نظم بار گذری ہے)

وہی مخمور دلربا آنکھیں
وہی کاجل کی دل نشین تحریر
ہاں وہی جسم کے حسین خطوط
ہاں وہی زلف کی گھنی زنجیر
وہی ترشے لبوں کے نازک جام
ابرؤں کی وہی سبک شمشیر

جیسے ٹیگور کا کوئی نغمہ

جیسے چغتائی کی کوئی تصویر

(نظم کسی کو دیکھ کر)

ان اقتباسات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ جاں نثار کا عشق ماورائی نہیں سراسر جسمانی ہے جس میں سوز ہجر اور لذت وصل کی کیفیات محض روایتی یا تصوراتی نہیں بلکہ وارداتی عنصر غالب ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کے تخلیقی عمل میں انفرادی تجربوں اور مشاہدات ذاتی کا اہم کردار ہے۔ مادرالوجود تشبیہات اور اشعاروں کا برمحل استعمال۔ شگفتہ تراکیب ۔سراپا نگاری ان کی رومانی نظموں کے امتیازی خصائص ہیں۔ اگر دور جدید کے اس رومانی شاعر کا موازنہ کلاسیکی شاعری کی روایت کے پیش نظر کیا جائے تو جاں نثار کی شاعری کے بہت کچھ حکیم مومن خاں مومن کی شاعری سے ملتے جلتے نظر آئیں گے۔ مومن کا عشق بھی ارضی اور جسمانی اور اصلاً عورت کی محبت سے عبارت ہے جاں نثار اختر بھی بنیادی طور پر محبت کے شاعر ہیں۔ عورت سے عشق اور اس کے تجربات جذباتی ردعمل کی ان کی رومانی شاعری کے جزولا ینفک ہیں۔ جاں نثار کی رومانی شاعری کے بارے میں حفیظ الکبیر لکھتے ہیں۔

''اختر بنیادی طور پر محبت کا شاعر ہے۔ اختر کی شخصیت رومان پرور ہے اور وہ اپنے رومانوں میں کامیاب رہا ہے۔ ان کی شاعری میں ناہید اور انجم کے نام اکثر ملتے ہیں۔ ہوسکتا ہے یہ نام فرضی ہو لیکن ان کی شخصتیں اس عالم رنگ د بو کی تمام جلوہ سامانیاں لیے ہوئے ہیں۔

ان کی حسین یادوں سے شاعر کے ذہن میں حسن تخلیق کی کلیاں چٹکتی
رہتی ہیں۔ ایسے ہی حسین اور باطنی تجربات شعری جذبوں میں شدت
اورتحریک پیدا کرتے ہیں۔ اختر کی رومانی تخلیقات میں خلوص درد ترنم
اور کیف ملتا ہے۔ وہ اپنی یادوں کا مرہون منت ہے۔[۱]

جاں نثار اختر کی رومانی شاعری کی ایک اہم خصوصیت ان کی سراپا نگاری ہے۔ اس سلسلے میں میں ان کا موازنہ اگر کسی شاعر سے کیا جاسکتا ہے تو وہ فراقؔ ہیں۔ کیونکہ فراق کو بھی محبوب کا سراپا لکھنے میں ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ جاں نثار نے سراپا کے بیان میں اکثر حیاتی نقوش ابھارے ہیں اور ان کی اکثر نظمیں محاکاتی فضا سے روشن ہوئی ہیں۔

نظروں میں تیری جذب سا ہوتا ہوا عالم
پلکوں میں تری سانس سے لیتے ہوئے لمحات
عارض پہ مچلتی ہوئی ہر بار شفق سی
آنکھوں میں کٹوروں سے ابلتے ہوئے جذبات

بکھرے ہوئے بپھرے ہوئے مچلے ہوئے گیسو
وہ محابا کر زلف رسا یاد تک

---

[۱] جاں نثار اختر اور اس کی شاعری از حفظ الکبیر مجوالہ جاں نثار اختر نمبر حیات وفن ص ۱۳۵

ان کی حسین یادوں سے شاعر کے ذہن میں حسن تخلیق کی کلیاں چٹکتی
رہتی ہیں۔ ایسے ہی حسین اور باطنی تجربات شعری جذبوں میں شدت
اورتحریک پیدا کرتے ہیں۔ اختر کی رومانی تخلیقات میں خلوص دردترنم
اورکیف ملتا ہے۔ وہ اپنی یادوں کا مرہون منت ہے۔[۱]

جاں نثار اختر کی رومانی شاعری کی ایک اہم خصوصیت ان کی سراپا نگاری ہے۔ اس سلسلے میں میں ان کا موازنہ اگر کسی شاعر سے کیا جاسکتا ہے تو وہ فراقؔ ہیں۔ کیونکہ فراق کو بھی محبوب کا سراپا لکھنے میں ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ جاں نثار نے سراپا کے بیان میں اکثر حیاتی نقوش ابھارے ہیں اوران کی اکثر نظمیں محاکاتی فضا سے روشن ہوئی ہیں۔

نظروں میں تیری جذب سا ہوتا ہوا عالم
پلکوں میں تری سانس سے لیتے ہوئے لمحات
عارض پہ مچلتی ہوئی ہر بار شفق سی
آنکھوں میں کٹوروں سے ابلتی ہوئے جذبات

بکھرے ہوئے بپھرے ہوئے مچلے ہوئے گیسو
وہ محابا کر زلف رسا یاد تک

---

[۱] جاں نثار اختر اوراس کی شاعری از حفظ الکبیر بحوالہ جاں نثار اختر نمبر حیات دفن ص ۱۳۵

نکہت شام و عطر بادصبا
کیا ہے جز تیرا فیض پیراہن
صبح کی نرم لوجیں تری
پگھلا پگھلا سا آنچ پر کندن

جاں نثار اختر کا خاص وصف یہ ہے کہ وہ اکثر بصری پیکروں میں جذبے کی ساری توانائیاں اور تابناکیاں سمودیتے ہیں۔ان کی شعری پیکروں کا مقصود احساسات اور ارتقاسات کی ترسیل ہے۔ان کی نظم مذکورہ بالا ''یاد ہے اب تک'' کا مطالعہ مومن کی مشہور غزل ''وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو'' کی یاد تازہ کرتی ہے اسی طرح مجاز کی ایک نظم ''مہمان''ٹیپ کا مصرہ ہے'' آج کی رات اور باقی ہے'' یہی نے جاں نثار اختر کی نظم'' آخری وار آج باقی ہے'' کی بھی ہے جسے مجاز کی خوشہ چینی میرے خیال سے درست ہوگا۔جاں نثار کی اکثر نظموں کا یہی رویہ نظر آتا ہے۔فیض کی نظم۔''مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ'' کے خیال کو اپنا کر انھوں نے۔'' زندگی صرف محبت تو نہیں انجم'' ''میں بہت دور چلا جاؤں گا''۔وغیرہ نظمیں لکھیں۔فریب پیار کے عنوان سے ۱۵؍اگست کے لکھی گئی نظم پر جذبی کی نظم ''بے زار نگاہیں'' کی گہری چھاپ ہے۔

میں نے جانا تھا کہ اس وقت بڑھا ہے جو یہ ہاتھ
اب میرے ہاتھوں سے یہ ہاتھ نہ کھینچے گا کوئی

میں تو سمجھتا تھا کہ تا حشر رہے گا یہ ساتھ
میں تو یوں خوش تھا کہ اب ساتھ نہ چھوڑے گا کوئی

(جذبی)

جاں نثار اختر اپنی نظم میں آزادی سے متعلق یہ سوچتے ہیں۔

میں تو یوں خوش تھا کہ آزاد ہوا میرا وطن
میں تو یوں خوش تھا کہ چھوٹا وہ غلامی گہن
میں تو یوں خوش تھا کہ اب رات نے کھینچا دامن
میں تو یوں خوش تھا کہ اب صبح ہوئی جلوہ فگن

ان تمام اذکار کی روشنی میں یہ کہنا درست ہوگا۔ کہ جاں نثار کی نظموں میں رومانیت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے ان کی بیشتر نظمیں اکہرے جذبے کی زایدہ ہونے کے باوجود تخلیقی توانائی اور شدیت کے اظہار سے عبارت ہیں۔ اور یہ کہ شاعر کا ذہن تخلیقی اور توانا ہے۔

امن نامہ۔

جاں نثار اختر کا ۱۹۵۲ کا زبردست تخلیقی کارنامہ ہے۔ دراصل اسی نظم کی محرک اور امن تحریک ہے جس کے منشور میں ہی یہ اپیل کی گئی تھی کہ روئے زمین پر بسنے والے تمام انسان دنیا میں امن چاہتے ہیں۔ اس اپیل کے مختصر نامے پر مختلف ممالک کے سیکڑوں لوگوں نے اپنے

دستخط کیے تھے۔ اس اپیل میں جنگ کی ذمہ داری مغربی طاقتوں پر ڈالی گئی تھی۔ اورادب کا یہ خاص وصف رہا ہے کہ ہمیشہ ہر تحریک سے متاثر ہوا اوران موقع پر اس نے اپنا مثبت کردار بھی ادا کیا ہے جو اس کے حیات ونمود کی علامت ہے۔ اردو شعرا نے امن کے موضوع پر بے شمار نظمیں لکھیں اور ترقی پسند شعرا میں تو سبھی نے اس موضوع پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے۔ اختر کا امن نامہ اس تحریک کی پیداوار ہے جس میں ان کی فنی مہارت اور خلوص فکر نمایاں ہے نظم کی ابتدا ساقی نامہ سے ہوتی ہے۔ ابتدائیہ کے بعد موضوع کی طرف گریز ملاخطہ ہو۔

اڑا تیرے چہرے کا کیوں رنگ ہے
ارے تجھ کو بھی خطرۂ جنگ ہے

جنگ کی تباہ کاریوں اور نتائج کے ذکر کے بعد جنگ کا نقشہ یوں پیش کیا ہے۔ ؎

یہ ناگن سیہ پھن اٹھائے ہوئے
یہ ڈائن کلیجہ چبائے ہوئے
یہ سرمایہ داروں کی پالی ہوئی
سدا شہریاروں کے پالی ہوئی

بھیانک ہنسی کھوکھلی سی نظر

کھڑی سرلاشوں کے انبار پر

جو لبی ہو تو یہ دشمن نام و ننگ

یہ محبوبہ بیرزال فرنگ

مٹادے زمانے کا نام و نشاں

بنادے فلک کو زمین کا دھواں

جنگ کی سیاہ ناگن۔ ڈائن بیرزال فرنگ کہا اور اسے سرمایہ داروں کی پالی ہوئی معمرانا شاعرانہ عبارت اور کمال تخیل اور صناعی اور فنی مہارت کی دلیل ہے۔ بھیانک ہنسی۔ کھوکھلی نظر سردلاشوں کے انبار پر ڈائن کا ناچنا جنگ کی ہیبت ناکی کی مظہر ہے امن کا پرچم یوں بیان ہوا ہے۔

کیا ڈالروں کے خرید ے غلام

کہاں ساری دنیا کے جاگے غلام

کہاں موت کی سرد تاریک رات

کہا اسٹالن کی جاں بخش بات

۱۹۰۲ء میں اسٹالن کے ہاتھ جو مزدوروں کے انقلاب میں سرگرم کار تھے۔ یقیناً جاں بخش عشق تصور کیے جاتے تھے لیکن یہ تصورات یک لخت آج تبدیل ہو چکے ہیں اور انھیں جاں

بخش ہاتھوں کو خوں ریزی کا منبع قرار دیا جاتا ہے۔ نظم کا بقیہ ادھا حصہ دعائیہ اور شاعر کی امیدوں بھری آرزوؤں پر مشتمل ہے۔ یکا یک شاعر جنگ کا میدان چھوڑ کر وطن پرستی کے جذبہ سے سرسار ہوا اٹھتا ہے۔

ہمیں اپنی محبوب سے شاموں سے پیار
ہمیں اپنے شہروں کے ناموں سے پیار
ہمیں پیار اپنے ہر ایک گاؤں سے
گھنے برگدوں کی گھنی چھاؤں سے
رہے پاک گنگوتری کی پھبن
مچلتی رہے زلف گنگ و جمن
لٹاتی رہیں اپنی نینوں کا مدھ
یہ صبح بنارس یہ شام اودھ
لہکتا رہے سبز میداں میں دھان
زمینوں پہ جھکتے رہیں آسمان
مہکتے رہیں سبز آموں کے بور
بڑھاتی رہے پینگ جھولے کی ڈور
رہے یہ دیوالی کی جگ مگ بہار
منڈیروں پر جلتے دیوں کی قطار

حسینوں کے مہکیں بسنتی لباس
رہے نرم چہروں پہ ہلکی مٹھاس
رہیں لڑکیوں میں یہ گڑیوں کے کھیل
رہے چھک چھک آتی یہ بچوں کی ریل

اسی دلکش سماجی پس منظر میں تمناؤں کے حسین ہجوم۔ حقیقت نگاری کے سحر آفریں اور وجدآ گہیں کیفیات اور جذبہ حب الوطنی سے سرشاری عظیم کے ایک ایک لفظ سے نمایا ہے۔

ساقی نامہ۔

اردو شاعری میں ساقی نامہ کی روایت عربی اور فارسی کے راستے سے آئی۔ اسی طرح اس کی ہیئت اور موضوع رہین منت ہیں۔ قلی قطب شاہ کے دور سے لیکر عہد حاضر تک اکثر شعرانے اس روایت کی پابندی کی ہے مثنویات عموماً آغاز داستان سے قبل ساقی نامہ نظم کرنے کا رواج تھا۔ مرثیہ تک میں اس کا رواج رہا ہے۔ موجودہ دور میں شعرانے ساقی کو مخاطب کرکے سیاسی سماجی عمرانی اور فلسفیانہ مسائل کی عکاسی کی ہے جگر اور جوش کے یہاں اس کا انداز رندانہ اور وطنی جذبات سے مملو ہے جبکہ اقبال کا ساقی نامہ فلسفیانہ افکار کا ترجمان ہے۔ جان نثار اختر اس قدیم روایت کو انقلابی انداز دیا ہے۔

یہ کس نے کھٹکٹایا آج مے خانہ کا دروازہ
ہر اک میکش یکا یک بے پیئے برہم اٹھا ساقی

یہ کیسا مے کے بدلے خون چھلکا تیرے شیشے سے
یہ کیسا ساز سے اک نالۂ ماتم اٹھا ساقی
اشارے سے تجھکو بلالے نہ ساقی
تجھے میکدے میں بٹھالے نہ ساقی
ترے دل میں یہ بات ڈالے نہ ساقی
کہ یہ زندگی کیا ہے پینا پلانا

جان نثار کا عہد سماجی اضطراب افراتفری معاشرتی جبر واستحصال کا دور تھا۔ جاں نثار اس دور سے پوری طرح متاثر ہوئے اور ان کے دل میں یہ احساس پیدا ہوگیا۔ کہ وہ حقیقی مسرتوں سے کوسوں دور ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی سیاسی نظموں میں آزادی کی جدوجہد کی برملا حمایت اور ظالم ذنگی حکومت کو بدل ڈالنے کی زبردست خواہش نظر آتی ہے۔ اور وہ اپنے وطن کو غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہندوستانیوں کو تلقین کرتے ہیں۔

دروازے پہ دشمن آپہونچا
اٹھ ہوش میں آ اٹھ ہوش میں آ
حامی ہے اگر آزادی کا
تلوار اٹھا تلوار اٹھا

مٹ جائے نہ ہندوستان کا بھرم
اب دیر نہ کر اب وقت ہے کم

ٹیپو کی قسم ارجن کی قسم
تلوار اٹھا تلوار اٹھا
دشمن کی اگر چڑھ جائے گی
یہ قید تیری بڑھ جائے گی
زنجیر نئی گڑھ جائے گی
تلوار اٹھا تلوار اٹھا

مادر وطن کے قومی پرچم سے ان کی عقیدت ملاحظہ ہو ۔

زردی سے تیری رونما بے لوث خدمت کی لگن
تیری سفیدی سے عیاں انسانیت کا پاکیزہ پن
سبزی سے تیری جلوہ گر ہمت جوانی بانکپن

اے پرچم سہ رنگ تو
اپنے وطن کی آبرو

تو ہے ہمارا ننگ و نام
ہم تجھ کو کرتے ہیں سلام

اور وہ وطن کے جیالے نوجوانوں کی مجاہدانہ سرگرمیوں کو لائق آفریں قرار دیتے ہوئے انھیں تلقین کرتے ہیں۔

آج تو شمشیر کرتا ہے علم
موت کے سینے پہ رکھتا ہے قدم
موڑتا ہے زیست کی پتوار آج
آگ کا دریا کریں گے پار آج
چاک کرتا ہے گھٹاؤں کا نقاب
ظلمتوں سے چھینا ہے آفتاب

جاں نثار اختر کو وطن کی آزادی کے بے حد للک تھی۔ انھوں نے اپنی کئی نظموں میں اپنے جذبات کا بڑے والہانہ انداز میں ذکر کیا ہے جس سے ان کے خلوص کی تپش کا اندازہ کیا جا سکتا ہے حفیظ الکبیر قریشی لکھتے ہیں۔

''ہندوستان کی آزادی پر اس نے بھی بڑے سیانے خواب دیکھے تھے۔ اور وہ اس خواب کی تعبیر ایک خوبصورت پر امن اور مساوات کا حامل سماج کی تصور دیکھنا چاہتے تھے۔

آزادی کے موقع پر اس نے ہندوستان کی خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے۔

اے میرے ہندوستان میرے نگار جوان

تیرے لیے مدتوں میں اٹھائے ستم

تیرے لیے مدتوں میں نے پیئیں چکیاں

تیرے لیے مدتوں میں نے اٹھائے ستم

میں تجھے پالیا تونے مجھے پالیا

ہو نہیں سکتی کبھی سعی وفارائیگاں

اے میرے ہندوستان میرے نگار جوان

جاں نثار اختر کا تصور انقلاب بہت کچھ جوش کے تصور سے مماثلت رکھتا ہے۔ ان کی ابتدائی نظموں میں جوش کے لہجہ کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ لیکن جلدی ہی انھوں نے اپنی الگ راہ بنالی تھی۔ بقول احمد عباس'' جوش صاحب کے یہاں پرشوکت بلکہ پر ہیبت الفاظ کی گھن گرج ہے جاں نثار اختر کے یہاں خلوص کی کارفرمائی اور بے ساختہ پن ۱۹۴۲ء میں ایک موقع پر جوش نے جاں نثار اختر کی شاعری کا یوں تجر بہ کیا ہے۔

''اختر کی شاعری میں ہمیں زندگی کی حقیقتیں مناظر کے دلفریباں نفسیات کے کی باریکیاں اور رومان کی برتائیاں ملتی ہیں۔ اور یہ سب چیزیں ایسی سموئی ہیں کہ جس طرح کوئی بناض موسیقی متعدد راگنیوں کو

ملا کر ایک ایسا نغمہ شیریں پیدا کرتا ہے کہ بزم پر وجد کی سی کیفیت طاری
ہو جاتی ہے۔ اس کے دوش بدوش اختر کی شاعری میں جو انقلابی عنصر
تھا۔ وہ اس قدر جاندار اور جاندار کے ساتھ ساتھ دل کشی اور ہموار ہے
کہ دلوں پر براہ راست اثر پڑتا ہے۔'' [۱]

جاں نثار اختر کے تصور انقلاب کی اساس عوامی جدوجہد ہے جس کا ایک چھوٹا سا کرشمہ
ان کا یہ اعلان ہے۔

جو شانے پر بغاوت کا عَلَم لے کر نکلتے ہیں
کسی ظالم حکومت کے دھڑکتے دل پہ چلتے ہیں
میں ان کے گیت گاتا ہوں

ان دو مصروں میں جاں نثار کے دل دھڑکن صاف محسوس ہوتی جو وہ ہندوستانی عام کی
زبوں حالی۔ حکومت کی نا برابری اور قدرت کی ستم ظریفی پر ان کی گہرائی نگاہ کی علامت
ہے۔ ان کے روبرو انسان انسانی کی غلامی پر مجبور ہے اور فرنگیوں کا بڑھا ہوا عروج اس کا ہمدرد
نہیں بلکہ اس کا خون چوس رہا ہے۔ اور ظلم و ستم میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا ہے۔

وہ محنت سے بازو علاموں کے مثل
وہ مٹی کے سینے پہ لوہے کا ہل

---

[۱] فن اور شخصیت جان نثار اختر نمبر ص ۷۰ جوش ملیح آبادی

نہیں آب و گل کی پلٹتا ہوا
زمین کا کلیجہ الٹتا ہوا
اٹھائے غلامی کا شانوں پہ بار
غلاموں کی ہل میں جتی وہ قطار
مشققت سے ہلکان ہوتے ہوئے
پسینے سے کھیتوں کی بوتے ہوئے
وہ اکھڑی ہوئی سانس نکلی زبان
وہ پیٹھوں پہ کوڑے کے ابھرے نشان
وہ کھاتے ہوئے گرم لوہے کے داغ
بدن پر وہ جلتے لہو کے چراغ
وہ قدموں پہ آقا گرتے ہوئے
وہ بے جرم آروں سے چرتے ہوئے
اور ابن آدم کی تذلیل کا یہ حال ہے کہ
زمینوں کے ہمراہ بکتے غلام
وہ اٹھتے ہوئے آدمیت کے دام

اور کسانوں کی یہ المناک زندگیاں بھی جاں نثار کے پیش نظر ہیں۔ اور کبھی نہ ختم ہونے والے قرض سے جاں بلب کسان کی زندگی دیکھئے۔

وہ فاقوں سے مرتے ہوئے کاشتکار
کلیجوں پہ چھوتی ہوئی ہل کی دھار
بقایا چکاتے وہ مفلس کسان
وہ بکتے ہوئے ہل مویشی مکان

برخلاف اس کے زمیندار طبقہ اور روٴسا سیر و شکار مصروف اور شراب و شباب میں مدہوش رقص و سرور سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

وہ راتوں کی عشرت کہدوں کی بہار
وہ دلبر حسینوں کے سولہ سنگھار
برہنہ کنیزیں جھکائے نظر
شرابوں کی کشتی لیے دوش پر
وہ رنگین نغموں میں ڈھلتی شراب
وہ حد سے گذرتا مکیّف شباب
وہ فنکار رقاصد خوش ادا
وہ چھم چھم چھما چھم کی آتی صدا

ان حالات میں وہ انھیں خلاکت زدہ محنت کشوں مزدوروں اور نو جوان کی آمادہ پکار ہونے کے لیے ہمت دلاتے ہیں۔

کوئی تجھ کو باقی کیے بھی تو کیا ہے
زمیں پر تراخوں بہے بھی تو کیا ہے
جوانی مظالم سہے بھی تو کہا ہے
یہ تیرا زمانہ ہے تیرا زمانہ
مسافر کہیں راہ مت بھول جانا

اور پھر انقلابیوں کو یوں مہمیز کرتے ہیں۔

ساتھیو حوصلہ شوق کو مہمیز کرو
ہاں قدم تیز کرو تیز کرو تیز کرو

اس کے ساتھ وہ ساری دنیا کی باور گرادینا چاہتے ہیں کہ ہم نے ان کے مصائب سے ہمت نہیں ہاری ہے بلکہ ہماری پستی ہمارے بلند عزائم کا غماز ہے۔ اور اب وہ دن دور نہیں رہے کیونکہ اب ہم نے کمر کس لی ہے اور یقین ہے کہ ؎

میری گرد راہ ہوں گے ماہ و انجم ایک دن
آسمان تا آسمان عزم سفر رکھتا ہوں
جذبہ بیدار وقلب یا چیز رکھتا ہوں میں
رات کے سپنے ہیں دز دیدہ نظر رکھتا ہوں

غرضیکہ جاں نثار کی نظمیں انسان کی پسر مردگی اور خلاکت بھری زندگی کا محض تحفہ نہیں بلکہ اس پس منظر میں انسان کے ارتقا اور اس کی حریت کا نغمہ ہے۔ جو انسان میں نئی حرارت نئی جرأت۔ امنگ اور حوصلہ پیدا کرتی ہیں۔

مرثیہ گوئی

جاں نثار اختر بے درد حساس دل رکھتے تھے جو ہر غم و خوشی سے بہت جلد متاثر ہو جاتے تھے۔ کسی غم سے متاثر ہو کر درد انگیز خیالات کا ہر دور میں اظہار ہوتا ہے۔ مرثیہ کا نام سنتے ہی ذہن فی الفور سانحہ کربلا اور ازکار مصائب آل اظہار کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اس لئے کہ اس موضوع پر بے شمار مراثی قلمبند ہوتے رہیں گے کیونکہ یہی وہ صنف ہے جو براہ راست ہر دل پر دستک دیتی ہے بقول ڈاکٹر مسود حسین رضوی.

''اردو کے خزانے میں مرثیہ ہی وہ پیش بہا گوہر ہے کہ اگر شاعری کے بازار میں ہماری زبان صرف اس جنس کو لیکر جا کھڑی ہو تو نگاہ دار جوہریوں کی نظر میں کسی زبان میں کم سرمایہ دار نہ ٹھہرے۔'' [۱]

جدید شاعری کی تحریک کے اثر سے اردو کی اہم اصناف سخن نے زندہ رہنے کے لیے ان کے نئے حالات سے سمجھوتہ کر لیا اس لیے مرثیہ کا مفہوم بدلا اس کا مقصد بدلا اس میں انسانی زندگی کے مسائل نے بھی دخل پایا افراد کربلا اور واقعات کربلا کے ذکر کے ساتھ دوسرے انسانوں اور واقعات بھی نظم کیے جانے لگے جو شخصی مراثی کے نام سے موسوم ہوئے حقیقت میں یہ مرثیہ کی ایک طرح کی توسیع ہے جاں نثار اختر نے شخصی مرثیہ کی روایت کو آگے بڑھایا انھوں نے جن شخصیات کا ذکر کیا ہے وہ ان کے درد۔ لگن خلوص اور اس سے وابستگی اور ان کے غم واندوہ کی تصویر لگتی ہے۔

خاک دل جان نثار اختر کا ایک نہایت دلدوز مرثیہ ہے جو انھوں نے صفیہ کی موت سے بے قرار ہو کر لکھی تھی۔ اختر سے دوری نے صفیہ کو ہجر کے دنوں نے بالکل نڈھال اور ہڈی کے ڈھانچے میں تبدیل کر دیا تھا۔ باوجود بے حد توجہ اور علاج و معالجہ کے کو وہ جانبر نہ ہو سکیں اور

---

[۱] ہماری شاعری ص ۱۳۰ پروفیسر مسعود حسین رضوی

۱۹۵۳ء میں انھوں نے جام اجل نوش کر لیا۔ اختر پر غم کا پہاڑ گویا ٹوٹ پڑا اور اس عظیم سانحہ کو انھوں نے ضبط وصبر سے برداشت کر لیا لیکن ان کی آہ سوزی کے لبوں تک اس طرح امنڈ آئی کہ وہ ایک دردناک مرثیہ بھی بن گیا۔ اس پر مزید نحک ہاشی اس وجہ سے اور بھی فروں ہوگئی کہ ان کی وقت رخصت اپنی محبوب بیوی کو الوداع کہنے کا موقع بھی نہ مل سکا اور وہ اسی وقت پہونچے جب صفیہ ایک تو وہ خاک تلے دفن ہو چکی تھی۔ جان نثار نے قبر دیکھ کر ایک زبردست مرثیہ کہا جو ہمیشہ درد والم کی تصویر پیش کرتا رہے گا۔ اس مرثیہ کے متعلق کرشن چندا اپنے ایک مکتوب بنام جاں نثار تحریر کرتے ہیں۔

''اس نظم پر تمہارے ذاتی غم کی جلن تو پڑی ہوئی ہے۔ لیکن اس جلن کے پیچھے ایک پورا ہندوستانی گھرانہ ہے مجھے اس نظم میں ایک ایسے سماج کی بنیاد نظر آتی ہے جو ابھی نہیں لیکن جسے ہونا ہے اس نظم میں انسان اور زندگی سے ایک ایسی ہی بھر پور محبت پائی جاتی ہے کہ موت اپنے کامیاب ترین لمحوں میں زندگی سے ہراساں نظر آتی ہے۔ اور جدائی کے آخری کربناک ثانیوں میں بھی وصال کا شبہ ہوتا ہے۔ جیسے صفیہ کا ہاتھ اب بھی تمھارے ہاتھ میں ہے جیسے اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اب تمھارے دل کو مئے شبانہ سے مخمور کیے ہوئے ہے۔ ذرا سوچو تو نوسال کی بلند اور متوازن رفاقت نے اردو کو یہ نظم دی۔ اور اگر یہ رشتہ محض جسمانی ہوتا تو یہ نظم کہاں سے ہوتی؟ ایک اچھی تخلیق کے پس پردہ زندگی کے تصور کی کتنی خوبصورتیاں اور مضبوطیاں چھپی ہوئی ہیں۔

اور کتنے طویل تسلسل کی صبر آزما کشمکش کے بعد ایک اچھی تخلیق معرض وجود میں آئی ہے'' [۱]

اس نظم میں جاں نثار اختر رنج والم جذبات واحساسات کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے یہ نظم انھوں نے صفیہ کی آخری آرام گاہ لکھنؤ کو اپنا وطن کہتے ہوئے اس دھرتی سے یوں کلام کرتے ہیں۔

لکھنؤ میرے وطن میرے چمن زار وطن
تیرے گہوارہ آغوش میں اے جان بہار
اپنی دنیائے حسین دفن کے جاتا ہوں
تو نے جس دل کو دھڑکنے کی ادا بخشی تھی
آج وہ دل بھی یہیں دفن کیے جاتا ہوں

اور پھر اسی لکھنؤ (مدفن صفیہ) کو یوں مخاطب کرتے ہیں۔

دفن ہے دیکھ میرا عہد بہاراں تجھ میں
دفن ہے دیکھ مری روح گلستان تجھ میں
میری گل پوش جوان سال امنگوں کا سہاگ
میری شاداب تمنا کے مہکتے ہوئے خواب

---

۱ زیر لب ص ۱۱ رتبہ صفیہ

میری بیدار جوانی کے فروزاں مہ وسال
میری شاموں کے ملامت تری صبحوں کا جمال
میر ی محفل کا فسانہ میر خلوت کا فسون
مری دیوانگی شوق میرا جنون
میرے مرنے کا سلیقہ میرے جینے کا شعور
میری خاموش وفا میرے محبت کا غرور
میرے نغموں کا ترنم میرے نغموں کی پکار
میرے شعروں کی سجاوٹ میرے گیتوں کا نکھار
اپنا پر خواب جہاں سونپ چلا ہوں تجھ کو
اپنا سرمایہ جاں سونپ چلا ہوں تجھ کو
لکھنؤ میرے وطن میرے چمن زار وطن

جاں نثار کی اپنی بھٹکی زندگی میں صفیہ کی ڈھارس اور رہبری حاصل رہی اور انھیں زندگی کا حوصلہ دیتی رہی۔ صفیہ کی موت ان کی زندگی کا المناک ترین واقعہ ہے اس بے چینی لمحات زندگی کے مجبور ہاتھوں میں کرب کے ٹوٹے ہوئے دل کی خراش اس تک حد ہے کہ..

اے مری روح چمن خاک لحد سے تیری
آج بھی مجھ کو تیرے پیار کی بو آتی ہے

میں اور آن آنکھوں سے دیکھوں تجھے پیوندِ زمیں
اس قدر ظلم نہیں ہائے نہیں ہائے نہیں

آخری میں صفیہ کی قبر سے بچھڑنے کا یہ منظر ملاحظہ کیجئے۔

چوم کر آج تیری خاک لحد کے ذرے
ان گنت پھول محبت کے چڑھائے جاتا ہوں
جانے اس سمت کبھی میرا گزر ہو کہ نہ ہو
آخری بار گلے تجھ کو لگاتا جاؤں

حمدیہ کالج بھوپال کی میگزین کے ایڈیٹر کے نام خط میں اسی طرح کے جذبات کا اظہار کیا ہے۔

''صفیہ نے زندگی بھر میری محبت میں ساتھ دیا۔ ایک سچی رفیق ایک بہادر ساتھی کی طرح اور آج بھی اس کی موت نے مجھے زندگی سے بیزار نہیں کیا ہے۔ بلکہ زندگی کی جدوجہد کی قوت بخش دی ہے۔ جس منزل کا خواب ہم نے آج تک دیکھا جس صبح کا انتظار ہم اب تک کرتے رہے وہ منزل ضرور آئے گی۔ اگرچہ صفیہ اس صبح کے دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہ سکی لیکن مجھے یقین ہے کہ جب بھی وہ صبح طلوع ہو گی

صفیہ اس میں ضرور مسکرائے گی'' [1]

اس نظم (مرثیہ) کے دامن میں درد والم کی کہانی بلکہ داستان سمٹی ہوئی ہے۔ سبک اور نرم لہجہ۔ الفاظ سادہ لیکن نہایت درد خیز ہیں۔ حالانکہ مرثیہ شخصی ہے پھر بھی اس کی گونج آفاقی بن کر قاری کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ ایک رومان بھری فضا میں المناکیوں کا ذکر کچھ ایسے پیرایہ میں کہ سانحہ سماعی نہ کر مرثی شکل میں سامنے آجاتا ہے۔ اس نظم میں ان فنی مہارت اور صناعی بلندیوں کو چھوتی محسوس ہوتی ہے۔ بظاہر ان کی تمناؤں کا گلشن آرزوؤں کا مدفن بن گیا صرف محرومیاں ہی محرومیاں جلو میں ہیں۔ ایسے میں صفیہ کا عطا کرتا عزم انھیں جینے کا حوصلہ دیتا ہے۔

زندگی دیکھ مجھے عزم سفر دیتی ہے
ایک دل شعلہ بجاں ساتھ لیے جاتا ہوں
ہر قدم تو نے کبھی عزم جوان بخشا تھا
میں وہی عزم جواں ساتھ لیے جاتا ہوں

بقول کرشن چندر:۔

''اس نظم میں سماج کی بنیاد نظر آتی ہے شخصی مرثیوں کے روایتی انداز سے ان کی طرز مختلف ہے دراصل اردو منظومات میں نظم شاہکار نظم

---

[1] حمیدیہ کالج بھوپال میگزین ۱۹۵۵ء ص ۲۰

ہے۔" [۱]

اس کے علاوہ کچھ اور شخصی مراثی انھوں نے قلمبند کئے ہیں جیسے مہاتما گاندھی کی موت پر ۔ جواہر لال نہرو کے انتقال پر۔ علامہ اقبال کی موت پر۔ (ہر زبان فارسی) اور رشید مودودی وغیرہ۔

جان نثار کو جواہر لال نہرو سے خاص لگاؤ تھا ان کی موت کے موقع پر کہی گئی نظم جو ریڈیو پر بھی نشر ہوئی تھی اس سے یہ اشعار دیکھئے۔

ہوائیں اپنے آنچل میں یہ کس کی خاک لے آئیں
کسی ماں کی طرح دھرتی ہے اپنی گود پھیلائے
سلام اس کی لگن اس کی محبت اس کی خدمت کو
کہ جو ایسے جئے ایسے مرے اور ایسے مٹ جائے
سلام اس کی تمنا کو سلام اس کی وصیت کو
کہ جس دھرتی سے پیدا تھا اس دھرتی کے کام آئے

نظم رم شوق (رشید مودودی کا مرثیہ) جو کسی حادثہ کی پیداوار کہا جا سکتا ہے۔ جاں نثار کے اندر بے زاری کا احساس ظاہر کرتا ہے۔ اس کا انداز ان کی نظم بیزاری سے ملتا جلتا ہے اس نظم کا آخری بند رثائیت لیے ہوئے ہے۔

---

[۱] زیر لب ص ۱۰

پیچ وتاب دل یہ مرا زردار روشباب

طوفان ابروباد میں بھٹکا ہے آفتاب

تو ہی بتا کہ ٹوٹ کے تارا کدھر گیا

اڑتا ہوا میں شرارا کہاں گیا۔

''جاں نثار اختر کے یہ شخصی مرثیہ ان کی شعری انفرایت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ان مرثیوں میں روایت کے برعکس رجائیت کا عنصر قوی محسوس ہوتا ہے۔ مجموعی طور سے یہ مرثیہ جاں نثار کی دردمندی۔ انسان دوستی اور حساس طبع ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ بقول خلیل الرحمٰن اعظمی'' ان نظموں سے ان کے اپنے دل کی دھڑکن بھی شامل ہوگئی ہے۔اس لیے ان میں تاثیر کا عنصر بدرجۂ اتم ہے'' [1]

---

[1] اردو میں ترقی پسند تحریک دیباچہ ص ۶ خلیل الرحمٰن اعظمی

(باب چہارم)

دیگر اصناف سخن پر طبع آزمائی

قطعات

دوسری اصناف کی طرح قطعہ بھی اردو میں فارسی کے راستہ سے آیا۔ قطعہ کا مقصد کسی حقیقت کا مسلسل لیکن مختصر بیان ہے۔ تسلسل اظہار کے خیال ہی سے قطعہ کا وجود ہوا۔ چنانچہ مختصر طور پر تسلسل سے کسی بات کو قطعہ کی صورت میں کہا یا بیان کیا جا سکتا ہے۔ قطعہ میں مطلع کی بھی کوئی قید نہیں ہے۔ ہر دور میں قطعہ میں مختلف قسم کی تبدیلیاں بھی ہوتی رہی ہیں لیکن بنیادی مقصد وہی رہا ہے یعنی مختصر تسلسل بیان۔ قطعہ کے لغوی معنی ہیں ٹکڑا قطعہ قصیدے کی طرح غزل اور رباعی سے مختلف صنف سخن ہے۔ اس میں بھی رباعی یا قصیدے کی طرح ایک مرکزی خیال ہوتا ہے۔ جس کے تحت قطعہ کہا جاتا ہے۔

انقلاب ۱۸۵۷ء سے پہلے بھی اردو شاعری میں روزمرہ کے واقعات و حالات نظم کیے جاتے تھے۔ لیکن ان کی رفتار قدرے مست تھی۔ اس دور میں گل و بلبل کی شاعری ہی کا عمومی طور پر چلن تھا جس کی بنا پر داخلی معاملات اور سماجی حالات کے نظم کرنے یا اس طرف متوجہ کرنے کا کوئی رجحان نہیں تھا۔ مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ اس دور کا شاعر صرف لفظوں سے کھیل رہا تھا۔ شاعری کا کوئی واضح اور صحت مند مقصد اس کے سامنے نہیں تھا۔ ترقی پسند مصنفین کی کوششوں سے ہمارا ادب زندگی سے قریب ہوا عشقیہ حالات نظم کرنے کے ساتھ ساتھ مسائل حیات کی ترجمانی بھی شاعری کا جزو بننے لگیں۔ اور چھوٹی چھوٹی نظموں میں نہ زندگی کی عام مسائل کا ذکر کیا جانے لگا اس دور میں اکبرؔ۔ حالیؔ۔ شبلیؔ کے یہاں قطعہ نگاری کا شعور بالخصوص نمایاں طور پر نظر آتا ہے اکبر حالی اور شبلی کی مقابلے میں قطعہ نویسی میں فوقیت کے حامل تھے۔ لیکن حالی ان مختصر نظموں یا قطعہ نگاری کے پیش رو میں جنکی خوبصورت شکلیں اقبال۔ شبلی۔ ظفر علی خاں اکبرالہ آبادی کی نظموں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ جن کی حیثیت تاریخی سچائی کا اظہار ہے دور جدید میں

اختر انصاری۔ ندیم قاسمی۔ امین فریں۔ نریش کمار شاد۔ عبدالحمید عدم۔ جاں نثار اختر وغیرہ نے قطعہ کی ہیئت میں نئے تجربے کیے ہیں ان کے قطعات میں عشق وحسن کی آمیزش کے ساتھ سماجی اور تمدنی حالات سیاسی مسائل۔ معاشی اور معاشرتی انکار کی طرف عام رجحان محسوس ہوتا ہے۔

جاں نثار اختر نے مختلف اصناف سخن پر اپنی طباعی اور فکر رسا کے جوہر دکھائے ہیں لیکن ان کی شاعری کے جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ رباعی اور قطعہ سے خصوصی لگاؤ رکھتے تھے۔ انھوں نے رومانی یا سیاسی نظموں اور غزلوں کے علاوہ قطعات اور رباعیاں بھی کہی ہیں۔ حالانکہ اس دور میں سیاسی سماجی۔ اور تمدنی مسائل قطعات یا رباعیات کے پیرائے میں نظم کرنے کا عام رجحان تھا۔ لیکن جاں نثار اختر کا زیادہ تر موضوع حسن وعشق ہی رہا ہے اور انھوں نے اس صنف کے رومانی شاعری تک ہی محدود رکھا۔ جاں نثار کی رومانی شاعری کی بنیادی اساس روایتی عشقیہ نظریات سے نہیں بلکہ خود ان کے تجربات ومشاہدات ہیں۔ محبوب کا رنگ وبو اور اس کی جلوہ سامانیاں۔ رومان میں ناکامیاں اور پھر درد کا مترنم اظہار ان کے قطعات میں ایک پر کیف پیار کا سماں پیدا کردیتا ہے۔ معشوق کی تعریف وتوصیف اور اس سے خطاب ملاحظہ ہو۔

کتنی معصوم ہیں تیری آنکھیں
بیٹھ جا میرے روبرو میرے پاس
ایک لمحے کو بھول جانے دے
اپنے ایک اک گناہ کا احساس
صرف تسکیں ہے دست ناز ترا

کم نہیں سوزش جگر پھر بھی

میر ی آنکھوں کے روبرو کے تو

ڈھونڈتی ہے تجھے نظر پھر بھی

انگڑائی یہ کس نے لی ادا سے

کیسی یہ کرن فضا میں پھوٹی

کیوں رنگ برس پڑا چمن میں

کیا قوس شام لچک کے ٹوٹی

سائنس (Physics) نے روشنی (Light) کی وصاخت کرتے ہوئے اس سچائی کو بیان کیا ہے کہ روشنی حب دو آئینوں کے بیچ ہوتی تو بے شمار شبیں ایک سے دوسرے آئنہ میں منعکس ہوتے ہوئے نظر آنے لگتی ہیں۔ جاں نثار نے اس لازوال سچائی کو اپنے قطعہ میں یوں پیش کیا ہے۔ حسن و عشق کی تجلی گاہ میں یہ تصویریں دو مقابل آئینوں کے درمیان عکس افگنی کے مانند ہیں۔ یہ حسین تشبیہ مقابل کے عنوان سے انھوں نے یوں پیش کیا ہے۔

اس تجلی گاہ حسن و عشق میں

کتنی تصوریں بناتا ہے دماغ

دو مقابل آئینو ں کے درمیان

عکس افگن جس طرح کوئی چراغ

ایک قطعہ کا عنوان ہے۔ ''ایک لمحہ''۔ اس کو خالص نفسیاتی تجربہ بیان کیا گیا ہے۔ منظر کشی کی سحر کاری کا لطف ملاحظہ ہو۔ طالب و مطلوب ایک مدت کے بعد ملتے ہیں اس ملاقات میں طرفین کا کچھ پس و پیش کچھ ہچکچاہٹ کچھ شرم کچھ ملن کی بیقراری جذبات کی جذباتی کیفیت خاص طور سے وہی محسوس کر سکتے ہیں جو اس منزل سے گزر چکے ہوں۔

مدت میں کسی کی آنکھوں سے ایک لمحے کو آنکھیں چار ہوئیں
کچھ سانس کسی کی رک سی گئی کچھ روح میری تھرا سی گئی
کچھ پچھلی وفائیں یاد آئیں کچھ عہد کبھی کے یاد آئے
کچھ میری نگاہیں جھک سی گئی کچھ ان کی نظر شرما سی گئی

اپنی وفاؤں کو یاد کر کے نگاہوں کا جھکنا اور عہد شکنی کے خیال سے معشوق کی شرمگیں انداز فطری امر ہے تہوار کی بنیادی سچائی خوشی اور مسرت ہے کچھ تہوار سماجی اور مذہبی طور پر منائے جاتے ہیں جیسے پندرہ اگست، عید۔ بقرعید۔ عید میلا دالنبی۔ ہولی۔ دیوالی۔ دسہرہ۔ بڑا دن وغیرہ یہ سب متحدہ طور پر خوشی کے رنگوں میں ڈوب جانے کے مواقع ہیں۔ ان سب خوشیوں میں ایک بڑی خوشی اور بھی ہے وہ ہے پیا ملن کا ساعت اپنے محبوب سے ملنے سے بھی بڑی خوشی اور کیا ہو سکتی ہے۔ سب بڑی خوشی اور سب سے بڑا تہوار یہی ہے۔ اسی موقع کی ایک محبوبہ کے جذبات دیکھئے۔

اتنے دن کے بعد کہیں تم

آئے ہو ساجن میرے دوارے

آج اندھیرے انگنا مورے

ناچ رہے ہیں چاند ستارے

اور اس کے بعد ملن کی یہ بیقراری دیکھئے سب سے پہلے اپنی وفاؤں کا احساس دلانے کا انداز اور بعد میں آغوش الفت میں ڈوب جانے اور خود سپردگی کا یہ انداز دیکھئے۔

آج بھی ساجن میں ہوں تمھاری

آج بھی تم ہو میرے اپنے

آج بھی ان آنکھوں میں لیے ہیں

پیار کے انمٹ گہرے سپنے

آؤ جاتی رات ہے ساتھی

پیار تمھارا دل میں بھر لوں

آؤ تمھاری گود میں ساجن

تھک کر آنکھیں بند سی کر لوں

اس کے ساتھ وخود جذبات سے لبریز روح اظہار بن کر یوں زبان شاعر سے نمودار ہوتی ہے۔

آئی ہوائیں جھانجھ بجاتی
گیتوں مورے انگنا جاگا
مورے ماتھے جھومر دمکا
مورے ہاتھوں کنگنا جاگا

ورنہ اس سے پہلے یہ سب پھیکا پھیکا اور بے رونق تھا۔ انسان ایسے واقعات ولمحات سے بھی دوچار ہوتا رہتا ہے کہ اپنے راز کو ہر ایک پر افشا نہیں کرتا لیکن اکثر اپنی بیوی سے بیان کر دیتا ہے اور پھر شاعر محوِ حیرت ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے۔

یہ راز سمجھ میں نہیں آتا میرے
ہر چند میں اپنا جائزہ لیتا ہوں
جو بات چھپاتا ہوں خود اپنے سے
وہ بات میں تجھ سے کیسے کہہ دیتا ہوں

اختر وہ دن دیکھنے کے آرزومند ہیں جب ہر ایک کو اپنی ازواجی زندگی کا ہر اعتبار سے سکھ نصیب ہو اس کا گھر امن و عافیت ۔ پیار و محبت اور مسرت و شادمانی کا گہوارہ ہو زندگی کے ان حسین لمحات کی تابندگی غموں کے سایوں اور اندھیروں کو مٹادے ۔ ان کو اپنے حال پر بھی افسوس ہوتا ہے ۔ اپنے ساتھ وہ سب کی خوشی و خرمی کی آرزو کرتے ہیں

سکھیوں سے راز و نیاز ملاحظہ کیجئے ۔ لفظوں کی برجستگی اور فطری انداز محاکات کا لطف پیدا کرتا ہے

اودے اودے پہن رکھے ہیں کپڑے
دیوانی یہ رنگ کیا تجھے بھاتا ہے
جب ان کی پسند ہے تو سکھی مجھ کو بھی
اس رنگ میں ہر رنگ نظر آتا ہے

نادرالوجود تشبیہات حسین استعارے ہے ۔ اچھوتی تراکیب کے ساتھ رموز عشق کے بیان میں جاں نثار کو خاصی مہارت حاصل ہے ۔ والہانہ انداز اور فنی خوبیوں سے مالا مال یہ قطعات دیکھئے ۔

حسن کا عطر جسم کا صندل
عارضوں کے گلاب جسم کا عود

بعض اوقات سوچتا ہوں میں

ایک خوشبو ہے صرف تیرا وجود

یاد ماضی میں خیال تیرا

ڈال دیتا ہے دل میں اک ہلچل

دوڑتے ہیں کسی حسینہ کا

جیسے آجائے پاؤں میں آنچل

اک حسین جام میں ہیں غلطیدہ

کتنے نازک تخیلات کے موڑ

کتنے گل آفریں لہوں کا رس

کتنے رنگین آنچلوں کا نچوڑ

بچھڑنے کے احساس کا یہ انداز ہ دیکھئے۔

آج کسی نے کیا ہے عزم سفر

کون مجھ سے چلا ہے کوسوں دور

کیوں یہ محسوس ہو رہا ہے مجھے

جیسے میں تھک کے ہوگیا ہوں چور

جسم کا صندل، حسن کا عطر۔ زلف کا عود۔ گل آفرین لبوں کا رس۔ رنگین آنچلوں کا نچوڑ۔ جیسی نادر تراکیب نے قطعات میں جگمگاہٹ اور مہک پیدا کر دی ہے۔ ان قطعات میں بیان کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ حسن کا بے ساختہ پن جس میں کسی مبالغہ آرائی یا آورد کا کوئی دخل نہیں ہے۔ وفور جذبات سے دل شاعر پر جو کیفیت طاری ہوئی اس کا اظہار یا ردعمل مناظر قدرت پر ملاخطہ ہو۔

چند لمحوں کو تیرے آنے سے
تپش دل نے کیا سکوں پایا
دھوپ میں جیسی کو ماروں کی
ابر کا جیسے دوڑتا سایا
ایک کمسن حسین لڑکی کا
اس طرح فکر سے ہے مکھڑا ماند
جیسی دھندلی کہر چمیلی پر
جیسے ہلکی گھٹا کے اندر چاند
ہائے یہ تیرے ہجر کا عالم
کس قدر دور ہے حسیں مہتاب
اور یہ مست آبشار کی لے
کوئی روتا ہو جیسے پی کے شراب

یہ کسی کا ڈھلک گیا ہے آنچل

تاروں کی نگاہ جھک گئی ہے

یہ کس کی مچل گئی ہیں زلفیں

جاتی ہوئی رات رک گئی ہے

اک ذرا رسمساتے سوتے میں

کسی نے رخ سے الٹ دیا آنچل

حسن کجلا گیا ستاروں میں

بجھ گئی ماہتاب کی مشعل

آنچل کے ڈھلکنے سے تاروں کی نگاہوں کا تاب حسن نہ لاکر جھک جانا۔ ماہتاب کی مشعل بجھ جانا۔ زلفوں کے مچلنے اور اسکی سیاہی بکھیرنے سے گویا رخصت ہوتی رات رک سی گئی ہو۔ آنچل الٹ جانے رخ محبوب کے روبرو ستاروں کا حسن کجلانا۔ محبوب کے آنے کا یہ اثر انداز ہونا کہ جیسے پہاڑوں کی کڑی دھوپ میں ابر کا سایہ تھوڑی دیر کو دوڑتا ہوا آیا اور کمسن حسینہ کے فکر مند ہونے کو چمیلی کے پھول پر کہر چھا جانے سے تعبیر کرنا۔ زور ماہتاب امد آبشار کو ہجر یاد میں روتا ہوا دیکھنا۔ ایسی عنقا صفت تشبیہیں ہیں جن کی مثال ملنا دشوار ہے۔

حسن کی مختلف کیفیات کے پس منظر میں کائنات اور مناظر قدرت پر جو اثر ہوتا ہے اس کا احساس دل جو شاعر میں پیدا ہوتا ہے اس کا ردعمل دیکھئے۔

یوں ندی میں غروب کے ہنگام
جگمگاتی شفق فروز کرن
چلتے چلتے بھی آئینہ دیکھے
جسے کوئی سجی سجائی دلھن

دور وادی میں یہ ندی اختر
کیسے میٹھے سروں میں گاتی ہے
گلے کے اس حسین دھند لکے میں
کیا یہیں بھیرویں نہاتی ہے

ابر میں چھپ گیا ہے آدھا چاند
چاندنی چھن رہی ہے شاخوں سے
جیسے کھڑکی کا ایک پٹ کھولے
جھانکتا ہو کوئی سلاخوں سے

تتلی کوئی بے طرح بھٹک کر
پھر پھول کی سمت اڑ رہے ہے
ہر پھر کے مگر تیری ہی جانب
اس دل کی نگاہ مڑ رہی ہے

ان قطعات کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے شاعر کو مناظر قدرت میں ابھی

اپنے محبوب کا حسن اور اس کا جلوہ چھپا نظر آتا ہے۔ اس کی نگاہ ہر منظر میں اپنے محبوب کو جیسے ڈھونڈھ لیتی ہے۔ یہ صورت حال شاعر کے عشق کی پختگی کا ثبوت ہے۔ جاں نثار عشق کے معاملے میں طبیعتاً خوددار ہیں۔ ان کی محبت گہرائی لیے ہوئے مگر خاموش ہے وہ زبان سے اظہار محبت پر مشکل ہی سے قادر ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں صفیہ کی زبانی ملاحظہ ہو۔

''محبت اور خیال کے بارے میں وہ ضبط کے قائل ہیں۔ جس کا انھیں جتنا زیادہ خیال ہو اتنی ہی کڑی نظر رکھیں گے۔ اور اظہار سے بچیں گے زبان سے اس کا اعتراف کرنے میں وہ اپنی شکست سمجھتے ہیں......اپنے احساس کی راز داری انھیں عزیز ہے'' [۱]

اختر کے اس مزاج نے ان کی شاعری پر گہرا اثر ڈالا ہے کسی کو چاہنے سے زیادہ چاہے جانے کی آرزو ابتدا ہی سے جاں نثار کی شاعری کا نمایاں وصف ہے۔ مزاج کی اس خصوصیت نے جاں نثار کی شاعری میں ایک انفرادی شان پیدا ہوگئی ہے۔ اس لیے ان کی شاعری قدیم سے الگ اور ممتاز نظر آتی ہے۔ یہ قطعات ملاحظہ کیجئے۔

نامرادی کے بعد بے طلبی
اب ہے ایسا سکون جینے میں
جیسے دریا میں ہاتھ لٹکائے
سو رہا ہو کوئی سفینے میں

---

[۱] انداز نظر از صفیہ اختر ص ۸۶

دوست تجھ سے اگر خفا ہو تو کیا
آپ سے بھی تو خود خفا ہوں میں
آج تک یہ نہ کھل سکا مجھ پر
بے وفا ہوں کہ باوفا ہوں میں

یوں ہی بدلا ہوا سا اک انداز
یوں ہی روٹھی ہوئی سی ایک نظر
عمر بھر میں نے تجھ پر ناز کیا
کسی دن تو بھی ناز کر مجھ پر

یہ مجسم شکستگی مری روح
اور باقی ہے کچھ نفس کا کھیل
اف مرے گرد یہ تری بانہیں
ٹوٹتی شاخ پر لپٹتی بیل

نامرادی کے بعد بے طلب ہونا روایتی عشق کے برعکس ہے۔ اگر جاں نثار اپنے محبوب پر ناز کرتے ہیں تو آرزومندی ان کا محبوب بھی ان پر ناز کرے۔ اگر ان کا محبوب ان سے روٹھ

سکتا ہے تو انھیں بھی خفا ہونے کا حق حاصل ہے۔ وہ محبوب کی گردن میں باہیں نہیں ڈالتے بلکہ محبوب ان کی گردن میں اپنی باہیں حمائل کر دیتی ہے۔ یہ جاں نثار کی زبردست خودداری کی دلیل ہے۔ گزرے ہوئے خوشگوار لمحات جاں نثار کے سرمایہ حیات ہیں۔ اس سرمایہ سے وہ سرشار ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ وصل یار انھیں حاصل ہے یہی خوشی انھیں مہموری کے دکھ سے نجات دلاتی ہے۔

یاد ماضی میں یوں خیال تیرا
ڈال دیتا ہے دل میں اک ہلچل
دوڑتے میں کسی حسینہ کا
جیسے آجائے پاؤں میں آنچل

اپنے آئینہ تمنا میں
اب بھی مجھکو سنوارتی ہے تو
میں بہت دور جا چکا لیکن
مجھ کو اب بھی پکارتی ہے تو

اپنی تسکین کے لیے اے دوست
تیرے غم سے نباہتا ہوں میں

کیسے کہدوں کہ تجھکو چاہتا ہوں
یہ تو اپنے کو چاہتا ہوں میں

میں کس سے ہنسوں کس سے بولوں
میں کس سے کروں اگر کروں پیار
خاموش ہوں اور سوچتا ہوں
جب تو ہی نہیں تو لب ہیں بیکار
کھو گئے دل میں کتنے ہنگامے
کتنے غم شادمانیاں کتنی
آج اس پر سکوت وادی میں
پرُ فشاں ہیں کہانیاں کتنی

کوئی آواز دے رہا ہے مجھے
دل میں بھولی سی یاد تازہ
اے غم دوست جاگ دیکھ ذرا
کھٹکھٹاتا ہے کوئی دروازہ

جاں نثار کے قطعات کا سرمایہ ان کی غزلوں نظموں گیتوں وغیرہ سے کم اہمیت نہیں رکھتا

ہے انھوں نے عشق ومحبت کی کیفیات کے والہانہ احساس کی عکاسی نہایت دلکش انداز اور منفرد طریقے سے کرکے اردو قطعات کی دنیا کو ایک نئ ہلچل ایک نیا ولولہ اور ایک نئ روشنی عطا کی ہے۔ ان کی دوسری اصناف کی طرح یہ قطعات کے اردو کے شعری ادب کا لایق قدر سرمایہ ہیں۔ گھر آنگن میں ۱۶۰ر اور دوسرے مجموعات میں ۶۰ رباعیاں اور قطعات تو منظر عام پر آکر ایک نئ جوت جگا گئے ہیں ان کے غیر مطبوعہ قطعات اگر شایع ہوجاتے تو یقین ہے کہ ایک اور اردو کے حق میں مزید عطیہ ہوتا ہے۔ بہرحال ان کا جو شعری سرمایہ ہے وہ مدتوں تاریخ ادب میں عقیدت اور احترام سے دیکھا جائے گا۔ اور جان نثار اختر کی حلاقانہ مہارت کا ثبوت فراہم کرتا رہے گا۔

گیت

یوں تو جاں نثار اختر کی شناخت ایک عظیم گو کی حیثیت سے مسلم ہے لیکن ان کے کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے نظم کے علاوہ غزل، گیت، رباعی، قطعہ، شخصی مرثیہ وغیرہ جیسی شعری اصناف میں بھی اپنی طباعی کے جوہر نمایاں کیے ہیں

گیت:۔ ایک انگریز مفکر کا قول ہے کہ ''Poetry is an out plow of emotion'' دراصل یہی گیت کی تعریف ہے۔ یہ ایک ایسی داخلی شاعری ہے جس میں شاعر اپنے محسوسات تجربات اور قلبی وارادات کو اس میں اس طرح سمو دیتا ہے کہ ان کی سچائی اور اثر آفرینی یقینی طور پر مستحکم ہو جاتی ہے۔ چونکہ جذبات انسانی طویل نہیں ہوتے اس لیے گیت بھی طویل نہیں ہوتے اس اعتبار سے گیت کی ایک اور خصوصیت اس کا اختصار بھی ہے اور جب یہی جذبہ مترنم ہو جاتا ہے۔ تو گیت بن جاتا ہے۔ یعنی گیت نمائی شاعری کی سب سے بہترین مثال ہے۔ لیکن ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی کا تجربہ ہے۔

> ''گیت یا گانا (Song) غنائی شاعری کی ایک مشکل ضرور ہے لیکن ہر گائی جا سکنے والی شاعری گیت نہیں کہی جا سکتی۔ گیت کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ہر بند کے آخر میں ٹیک یا ٹیپ کا مصرعہ یعنی وہ مصرعہ جو بار بار دہرایا جا سکے ضرور شامل ہو۔ یہی مصرعہ گیت کی پہچان ہے۔ گیت کار چاہے تو ہندی یا فارسی دونوں بحروں کو استعمال کرے یا کسی ایک کا یہ اس کی مرضی اور صلاحیت پر منحصر ہے۔'' [1]

گیتوں کے آغاز وارتقا کے ذکر سے عموماً ہماری تاریخیں تہی دامن ہیں لیکن ان کا وجود

---

[1] اردو گیت اور دوہے کے خالق ڈاکٹر از حامدی۔ مضمون نگار ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی مشمولہ سہ ماہی اردو لیوٹن (یو کے) جنوری تا جون ۲۰۰۴ء

ابتدا ہی سے نظر آتا ہے۔ عبدالقادر سروری نے غنائی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے گیت کی بھی تعریف کی ہے ان کے بیان سے بھی گیت کی قدامت کا اندازہ نہیں ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں۔

''یہ وہ نظمیں ہیں جو عموماً موسیقی اور رقص کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں۔ اور ان میں زیادہ تر حسن و عشق کے داخلی جذبات اور قلبی واردات کا بیان ہوتا ہے۔ غنائی شاعری عموماً زیادہ غور وفکر کا نتیجہ نہیں ہوئی۔ بلکہ پرجوش جذبات اس کے ماخذ ہیں۔ اس لیے کہ یہ فطرت انسانی کے جذباتی پہلو سے زیادہ واسطہ رکھتی ہے۔ زیادہ استدلال اور فکر کو متاثر کرنا اس طرح کی شاعری کا کام نہیں'' [1]

گیت اور اردو شاعری کا خوشگوار حصہ ہیں اور انگریزی صنف Lyric سے مشابہ ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا برٹینکا کے مقالہ نگار نے اسے ایسی شاعری سے تعبیر کیا کے جو آلات موسیقی پر گائی جا سکے۔ گیت کو عام طور پر ہندی شاعری کی صنف قرار دیا جاتا ہے لیکن یہ مفروضہ درست نہیں ہے۔ ہندی شاعری میں گیت کا سرمایہ جتنا قدیم ہے اردو شاعری میں بھی اس کی وہی عمر ہے اور ہر دور میں اس کا رواج رہا ہے۔ قلی قطب شاہ اور امیر خسرو سے لیکر اسماعیل میرٹھی۔ عظمت اللہ خاں۔ اور ان کے بعد اسد محمد خاں ندا فاضلی۔ عادل منصوری بیکل اتساہی اور ڈاکٹر فراز حامدی تک اردو میں اس کی تاریخ موجود ہے ان لوگوں نے صرف جذبات عشق کے بیانات پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ دوسرے مسائل حیات کی ترجمانی گیت کے حوالوں سے ہے مثلاً ڈاکٹر فراز حامدی کے گیت کے یہ بند ملاحظ کیجئے۔ اس میں عہد حاضر کی گھناؤنی سیاست کی زندہ تصوری نظر آئے گی۔

....

[1] جدید اردو شاعری ڈاکٹر عبدالقادر سروری

کرم کے ہاتھوں ہوگیا دھرم کا ستیا ناس
سچائی نے لے لیا گبھرا کر بن باس
گھر آنگن سے اٹھ گیا آپس کا وشواس

ساحل بھی ہولے کا طوفانوں میں گم
دور اندیشی ہوگئی فرزانوں میں گم

گیت ایک نازک صنف سخن ہے یہ ایک بنیاد اور ایک مقصدیت لیے ہوتی ہے اور کسی ایک مقصد کو واضح کرتے ہوئے بعد سے گیت پر اسے محیط کرنا اسے اور زیادہ مشکل بنا دیتا ہے۔ گیت کی یہی مقصدیت اس کے ٹیپ کا مصرع ظاہر کرتا ہے۔ ہر قوم اور ہر زبان میں گیت کا سرمایہ موجود ہے یہ گیت عوام کو مذاق جذبات اور احساسات کے ترجمان ہیں ان میں کچھ عامی گیت ہیں جنکی کوئی ادبی اہمیت نہیں ہے اور کچھ شاعر کے شعوری فن کی یہی گیت ادبی حیثیت کے حامل ہیں۔ کیونکہ ان کی تخلیق موسیقی کے اصولوں کے مطابق ہوتی ہے۔ گیت گانے کا رواج ہندوستان میں ویدوں کے زمانے سے نظر آتا ہے سام وید اور رگ وید میں گیتوں کی بھرمار ہے۔ ہندی میں تلسی داس۔ سورداس۔ میرابائی کے گیتوں کی ایک ادبی شان ہے۔ ان کا بنیادی مقصد اصلیت پیدا کرکے سوز دگداز پیدا کرنا تھا۔ امیر خسرو کی وہ عظیم ہستی ہے جنھوں نے مشترکہ تہذیب کے ارتقاء میں شعروسخن کے ذریعے نمایاں کردار ادا کیا ہے ان کے وہ گیت جو

انھوں نے اپنے پیر و مرشد خواجہ نظام الدین اولیا کی یاد میں کہے ہیں۔ ان کی اثر آفرینی اور مقبولیت آج بھی کم نہیں ہے۔ گیت لکھنے کا رجحان نظیر اکبر آبادی کے یہاں بھی کافی نظر آتا ہے۔ عظمت اللہ خاں نے با قاعدہ گیتوں کو ادبی حیثیت کا حامل بنایا اور افسر میرٹھی نے گیتوں کا رخ سادگی کی طرف پھیرا۔ استرا کی ذہنیت رکھنے والے شعرا نے اسے اپنے مقاصد کی تکمیل کا آلہ کار بنایا اور ترقی پسند مصنفین شعرا کے گیت اور نظمیں سرمایہ داری اور غلامی کی طرف نفرت اور بیزاری کے مظہر میں اردو زبان کی اہمیت اور افادیت۔ جمہوری مزاج اور عام فہم ہونے کی بنا پر ہندوستان کی بہت بڑی صنف ''فلم'' نے اس کو اپنا کر زیادہ سے زیادہ وسیلہ اظہار بنایا ہے۔ حالانکہ سیاسی حربوں کے پیش نظر فلم کی زبان کو ہندی کہا جاتا ہے۔ لیکن مصنفی یہ ہے کہ ۹۵ فیصد فلموں کی زبان اردو ہے جسے ملک بھر کے عوام بولتے ہیں۔ اردو شاعری اردو زبان اس کے مستقبل کا انحصار ہے اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے اعجاز صدیقی لکھتے ہیں۔

''موجودہ دور میں اردو کے دو ہی پلیٹ فارم ہیں۔ ایک مشاعرہ اور دوسرا فلم............دس دس پندرہ پندرہ ہزار لوگ مشاعروں میں شریک ہوتے ہیں اور کبھی اس سے بھی زیادہ رنگ و نسل کی امتیاز کے بغیر اردو شاعری کو پوری توجہ سے سنتے ہیں۔ خوش ہوتے ہیں اور متاثر بھی۔ ایسی ہی دلچسپی گانوں سے لی جاتی ہے جو عام طور پر اردو زبان میں ہوتے ہیں۔ عوام کو جب اس حد تک متاثر کیا جاسکتا ہے تو کیا اردو شعرا یہ نہیں کر سکتے کہ وہ اپنی زبان کو سب کی زبان بنا دیں پورے بھارت کی زبان'' [۱]

---

[۱] اردو شاعری پر اردو کا مدار اور مستقبل مشمولہ شاعر جنوری ۱۹۵۹ء ص ۸ مضمون نگار اعجاز صدیقی

فلم کے پلیٹ فارم سے اردو گیت کو مقبولیت حاصل ہوئی اور ریڈیو۔ ٹی وی۔ کیسیٹس
اور ریکاڈ نے اسے گلی کوچوں تک پہونچا دیا۔ ان گیتوں کی بڑھتی ہوئی مقبولیت نے بہت سے
اچھے شاعروں کو اس طرف متوجہ کیا۔ اور اسی طرح ان کے معاش کا ایک ذریعہ میں بھی ان کو
حاصل ہو گیا سب سے پہلے آرزو لکھنوی نے فلمی دنیا میں قدم رکھا اور پھر آغا حشر شکیل بدایونی۔
مجروح سلطان پوری۔ ساحر۔ کیفی اعظمی۔ تشیل شفائی۔ راجندر کرشن۔ کرشن چندر سعادت حسن
منٹو۔ راجنیدر سنگھ بیدی۔ عصمت چغتائی۔ خواجہ احمد عباس۔ مشاہد لطیف راہی معصوم رضا۔ خمار
بارہ بنکوی۔ راما نند ساگر وغیرہ نے فلمی دنیا میں پہونچ کر اردو گیتوں کی مقبولیت کو چرخ چہارم
تک پہونچا دیا۔ جان نثار اختر بھی حمیدیہ کالج سے مستعفی ہو کر ممبئ فکر معاش میں پہونچ گئے
تھے۔ لیکن ماضی کی کسک بھی ان کے ساتھ تھی۔ انھوں نے اپنے ایک شعر میں وقت کے ستم
رانوں کا ذکر کیا ہے۔ ؎

دیس میں جب پردیس سدھارے ہم پر بھی یہ وقت پڑا
نظمیں چھوڑیں غزلیں چھوڑیں ، گیتوں کا بیوپار کیا

شاعر عموماً خوددار اور حساس طبع ہوتا ہے وہ اپنی شاعری پر کسی قدغن کو برداشت نہیں
کرتا۔ لیکن فلمی دنیا کا ایک المیہ فلم سازوں کی بالا دستی۔ میوزک ڈائرکٹر کے احکام اور رضا
جوئی۔ اور ان کا شاعروں کے لطیف احساسات سے عدم واقفیت یہ تمام باتیں ایک اچھے شاعر
کے لیے پسندیدہ نہیں ہوتیں۔ یہاں آ کر انھیں اپنے فن کے تقدس کا احترام کرنا اور اسی وسیلے

سے کسب معاش کا مسئلہ حل کرنا ایک وقت طلب کام ضرور ہوتا ہے۔ آل احمد سرور کے لفظوں میں اسی صورت حال کو دیکھئے۔

''خوددار اور سر بلند شاعر فنی کمال اور عظمت کا لحاظ رکھتا ہے۔ اپنی جرأت مندی سے وہ فلم کے ارباب حل وعہد کے سامنے نہیں جھکتا۔ اس جرأت کردار سے یقیناً امید ہے کہ فلمی ادب اردو ادب کا اہم حصہ بن جائے گا۔ اور ایسے گیت اور ایسا ادب پیدا ہوگا جسے ادب کو فائدہ پہونچے گا۔'' [۱]

ان شعرا کی کوششوں سے فلم ساز اور فلم بین دونوں روشناش ہوئے اور رفتہ رفتہ فلم کے گانوں کا مذاق بھی تبدیل ہو گئے۔ ان کی ہیئت اور موضوع میں تبدیلی ہوئی۔ شکوہ ہجر اور شاد کامی وصل۔ محبّ وطن۔ سیاسی اور عمرانی مسائل۔ سماجی اور معاشرتی حالات کی عکاسی حیات اور تقاضائے حیات کے اذکار فلمی گیتوں میں جگہ پانے لگے۔ عام طور سے اردو شعرا نے ناقدری زمانے کا شکوہ کیا ہے جیسے میر کا یہ شعر۔

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس مفلسی میں عزت سادات بھی گئی

یاروں کا یہ شعر

---

[۱] نئے اور پرانے چراغ ص ۳۴۱ پروفیسر آل احمد سرور

گل پژمردہ ہوں کوئی نہیں ہے قدر داں میرا

تو ہی دیکھ اے میرے خلاق حسن رائیگاں میرا

فلم کی دنیا میں گیتوں کا معیار بلند ہو یہ کوئی اہمیت نہیں فلم کو کامیاب ہونا ہے۔ یہ معیار ہے۔ ایسے دل شگون ماحول میں جاں نثار اپنے کو ناکام محسوس کرتے رہے ایک موقع پر یہ شکایت زبان پر آ ہی گئی۔

''سب سے پہلی فلم جس میں میں نے گانے لکھے ساز تھی۔ یہ فلم ریلیز نہ ہوسکی۔ میں نے فلم کا مکمل اسکرپٹ Script منظر نامہ اور مکالمہ لکھا جس کا نام تھا۔ غزل۔ ہیرو اور ہیروئن تھے سنیل دت اور مینا کماری سنیل دت نے اسی کہانی میں مجھ سے تبدیلیاں چاہیں جن کے لیے میں تیار نہ ہوا......انھوں نے میری کہانی واپس کر دی'' [۱]

فلمی دنیا کے کرتا دھرتا لوگوں کی انا بالا دستی اور ناقدر شناسی۔ تنگ نظری اس اقتباس سے صاف ظاہر ہوتی ہے اس سلسلے میں جاں نثار کی خودداری دیکھئے۔

''پرکاش پنڈت سے انھوں نے اس زیادہ دلچسپ امر کا انکشاف کیا ''فلم انارکلی کا'' مشہور گانا آجان وفا آ'' میرا لکھا ہوا ہے لیکن فلم کمپنیوں کے پروڈیوسر اسے کسی دوسرے شاعر کا مان کر مجھ سے کہتے

---

[۱] فلم ویکلی کلکتہ ص ۴ ۵ر فروری ۱۹۷۱ء

ہیں کہ اختر صاحب اب گانا لکھئے'' [1]

جان نثار اختر کے ساتھ اسے قدرت کی ستم ظریفی ہی کہنا چاہئے شروع میں حالات ان سے برگشتہ رہے اور وہ کوئی فائدہ نہ حاصل کر سکے۔ رفتہ رفتہ حالات سے سمجھوتہ کر کے انھوں نے اپنی کوشش جاری رکھیں اور کئی فلموں۔ جیسے ڈنکا، سی آئی ڈی، نیا انداز، لیڈی، ڈھاکے کا ململ۔ کلپنا میں، اور میرا بھائی۔ انجانا سفر۔ ایک عورت چار آنکھیں۔ ایکتا۔ پیاسا ساون کے انھوں نے سبھی گیت لکھے۔ بعض ایسی فلمیں بھی ہیں جن کے انھوں نے صرف چند ہی گانے لکھے۔ اور جیسے استاد۔ بلیک مارکیٹ۔ رستم سہراب۔ منگو دادا وغیرہ کچھ فلموں جیسے لگن۔ ہمراہی۔ لیلیٰ مجنوں۔ پریم پربت کے گانوں نے جاں نثار کی فلمی دنیا میں ایک معتبر ساکھ قائم کر دی۔

جانِ نثار کے گیتوں میں اور اس کی روایت سادگی اور صداقت کا التزام نظر آتا ہے جذبے کی فراوانی اور غنائی کیفیت اور اثر آفرینی ہے۔ جذبات کی فراوانی دیکھئے۔ عاشق کو گوارا نہیں کہ اس کے محبوب کے حسن سے کوئی غیر استفادہ کرے۔ خواہ اس کا رقیب کوئی مہرئی چیز ہی کیوں نہ ہو۔ مثلاً آوارہ بادل کا یہ گیت ؂

میری جان زلفیں نہ کھولو کہیں رات ٹھہر نہ جائے
بیتاب ہوائیں ایسی ہیں خوشبو نہ اڑالیں بالوں کی
کھلتی ہوئی کلیاں چپکے سے رنگت نہ چرالیں گالوں کی

---

[1] جیون اور سنکلن ص ۸ جاں نثار اختر

یہ رنگ کہیں چھوٹ جائے نا یہ حسن بکھرنا جائے
میری جان زلفیں نہ کھولو کہیں رات ٹھہر نہ جائے

جدید نظم کی خصوصیات ملاحظہ ہو۔ (فلم باپ رے باپ)

تم نہ آئے گھٹا غم کی چھانے لگی
روٹھ کر چاندنی رات جانے لگی
رات جاگی تو آنسو برسنے لگے
ہم تمہیں دیکھنے کو ترسنے لگے
اور ٹھنڈی ہوا دل جلانے لگی
روٹھ کر چاندنی رات جانے لگی
تم نہ آئے گھٹا غم کی چھانے لگی

اب نظر کیا ملائیں نظاروں سے ہم
کیا کہیں ہائے جاتی بہاروں سے ہم
ہر خوشی ہم سے آنکھیں چرانے لگی
روٹھ کر چاندنی رات جانے لگی
تم نہ آئے گھٹا غم کی چھانے لگی

محبوب سے دوری۔ چاندنی رات کا روٹھ جانا۔ رات جاگنا۔ آنسو کا برسنا۔ عجیب کیفیت لیے ہوئے ہیں۔ دوسرے بند میں خوشی غم سے آنکھیں چرانے لگی۔ عجیب اور انوکھی بندش ہے اس فلم کا دوسرا گیت۔

اب بتا جائیں کہاں قسمت کے ٹھکرائے ہوئے
غم سے اکتائے ہوئے جینے سے اکتائے ہوئے
اپنی راہوں میں اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں
غم کے ہیں گھنگھور بادل دور تک چھائے ہوئے
اب بتا جائیں کہاں قسمت کے ٹھکرائے ہوئے

اپنے ارمانوں کا لٹتا کارواں دیکھا کیے
آشیاں جلتا رہا ہم بے زباں دیکھا کیے
چند آنسو رہ گئے پلکوں پہ نتھرائے ہوئے
اب بتا جائیں کہاں قسمت کے ٹھکرائے ہوئے

پہلے بند میں زمانے کے ستائے۔ ظلم کے مارے جائے عافیت کی تلاش میں سرگردان ہیں اور دوسرے بند میں بے بسی کا ایک دل خراش منظر پیش کیا ہے۔ گھر جلتا ہوا اور دھواں اٹھتا ہوا دیکھتے رہے مگر واہ رے بے بسی سب قابو سے باہر۔

جاں نثار نے مقامی رنگ کو اپنے گیتوں میں بڑے سلیقے اور فنی مہارت سے پیش کیا ہے۔ صرف تصوراتی یا خیالی خاکے پیش کرنے کے بجائے انھوں نے ہندوستانی تہذیب و معاشرت کے محاکاتی رنگ و روغن بھر کے مانوس مرقع پیش کیا ہے۔ ہندی گیت کا روایتی رنگ و عشق کی لطیف کیفیت بہرہ کی چبھن۔ ہندی زبان ولہجہ میں محبت کا براہ راست اظہار ملاحظ کیجیے۔

دیا تو جلا ساری رات رے بالم
پر تم لوٹ نہ آئے لوٹ نہ آئے

بکھر گئی ہے سیج سہانی
رووت ہے البیلی جوانی
چھلیا ایسا کت جا چھپے ہو
جی ہمرا کلپائے

دیاتو جلا ساری رات رے بالم
پر تم لوٹ نہ آئے لوٹ نہ آئے

(فلم ڈھاگے کے بلمل)

جاں نثار نے مقامی رنگ کو اپنے گیتوں میں بڑے سلیقے اور فنی مہارت سے پیش کیا ہے۔ صرف تصوراتی یا خیالی خاکے پیش کرنے کے بجائے انھوں نے ہندوستانی تہذیب و معاشرت کے محاکاتی رنگ و روغن بھر کے مانوس مرقع پیش کیا ہے۔ ہندی گیت کا روایتی رنگ و عشق کی لطیف کیفیت بہرہ کی چبھن۔ ہندی زبان ولہجہ میں محبت کا براہ راست اظہار ملاحظ کیجئے۔

دیا تو جلا ساری رات رے بالم
پر تم لوٹ نہ آئے لوٹ نہ آئے

بکھر گئی ہے سیج سہانی
رووت ہے البیلی جوانی
چھلیا ایسا کت جا چھپے ہو
جی ہمرا کلپائے

دیا تو جلا ساری رات رے بالم
پر تم لوٹ نہ آئے لوٹ نہ آئے

(فلم ڈھاگے کے ململ)

جان نثار اختر نے ایسے گیت بھی لکھے ہیں جس میں نازک جذبات و احساسات کی ترجمانی نہایت نازک انداز اور سادگی سے محمور زبان میں غزل کے طرز میں پیش کی ہے۔ فلم بلیک مارکیٹ کا یہ گیت ملاخطہ کیجئے۔

میں تمھیں سے پوچھتی ہوں
مجھے تم سے پیار کیوں ہے
کبھی تم دغا نہ دوگے
مجھے اعتبار کیوں ہے
مجھے کیوں پکارتی ہیں
یہ جواں جواں فضائیں
مجھے مل گئیں کہاں سے
یہ حسیں حسیں ادائیں
مری زندگی پہ چھائی
یہ نئی بہار کیوں ہے

جو قدم اٹھا رہی ہوں
وہ قدم بہک رہا ہے
میرے دل پہ ہاتھ رکھ دو

تمھیں انتظار کیوں ہے

تمھیں سامنے ہو میرے

میں جدھر نظر اٹھاؤں

تمھیں بھولنا بھی چاہوں

تو کبھی بھلا نہ پاؤں

میرے دل پہ ہائے اتنا

تمھیں اختیار کیوں ہے

میں تمھیں سے پوچھتی ہوں

مجھے تم سے پیار کیوں ہے

عورت کی پہلی محبت میں جذبات کا وفور اس کے نازک احساسات ۔ نا تجربہ کاری یہ کہ پہلی ہی بار کی محبت میں محبوب پر اعتبار کر کے مدہوش میں آئنہ دل کھول کر سب کچھ قربان کر دیتی ہے ۔ وہ ہر دکھ بھول جاتی ہے ۔ جاں نثار حسن و عشق کے روایتی معاملات کو بھی اسی طرح بیان کرتے ہیں ۔ عشق بے نیاز رسم وراہ ہوتا ہے ۔ حتی کہ اپنے عشق میں تاج وتخت کی پرواہ نہیں کرتا اور اس کی محبت کے سامنے شاہی تزک و احتشام یا اس کا جلال و جبروت بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے جاں نثار نے اسی جرأت عشق کو بیان کیا ہے ۔

آ کے پیار کے طوفان میں لہرا کے چلا آ

ہر قید کو ہر رسم کو ٹھکرا کے چلا آ
عاشق ہے تو ہر چیز محبت پہ لٹا دے
آ دل کے لیے جان کی بازی بھی لگا دے
آ جانے وفا......آ

دیوانہ محبت کا کہیں ڈر کے رکا ہے
دربار میں شاہوں کے کہیں عشق جھکا ہے
خود عشق کے دربار میں شاہوں کا جھکا دے
آ جان و فا ....آ فا

فکر کی گہرائی اور ''رس'' اختر کے گیتوں کا منصوعی وصف ہے۔ انھوں نے گیت جیسی نازک صنف سخن کے ذریعہ اپنے نرم گرم انداز میں وطن درستی کے جذبات ابھارنے کی کوشش کی اور ہلاکو، زارروس، ہٹلر جیسے سفاکوں کے انسانیت سوز اور ملک کی آزادی پر یقین مظالم، اور لایق نفرت ظلم اور ستم اور اس کے نتائج اور عبرت خیز تباہی اور بالا آخران کے انجام کا بھی ذکر کیا ہے۔ ملاخطہ ہو۔

سکندر بھی آئے قلندر بھی آئے
نہ کوئی رہا ہے نہ کوئی رہا ہے

ہے اب تیرے جانے کی باری بدیش
مرا دیش آزاد ہوکر رہے گا
سکندر کو پورس نے طاقت سے روکا
تو غوری کو پرتھوی کی ہمت نے روکا
جب خونی نادر نے چھیڑی لڑائی
تو دل کی گلیوں سے آواز آئی
لگالے تو کتنا بھی زور اے ستم گر
میرا دیس آزاد ہوکر رہے گا

پرتاپ نے جان دے دی وطن پر
شیوا نے بھگوا اڑایا گگن پر
مردوں نے کھائیں آزادی کی قسمیں
اور عورتوں نے کی جوہر کی رسمیں
کفن باندھ کر رانی جھانسی پکاری
میرا دیس آزاد ہو کر رہے گا

سراج اور ٹیپو ظفر اور رانا
تھا ہر ایک ان میں کا قوی دونا

یہاں لے کے بغاوت کی آندھی
تلک نہرو آزاد شیاجی گاندھی
بھگت سنگھ کی راکھ نے یہ پکارا
میرا دیس آزاد ہوکر رہے گا

ہلاکو رہا ہے نہ ہٹلر رہا ہے
مسولینی کا نہ ول لشکر رہا ہے
نہیں جب رہا روس نہ زار باقی
تو کیسے رہے گا سلا زار باقی
گوا کا ہر اک بچہ بچہ پکارا
میرا دیس آزاد ہوکر رہے گا۔

اس طرح جاں نثار کا مشہور مصرع۔

''ہر قدم باز ہمیں راہ دکھاتا ہے چلو''
اس وقت کی پیداوار ہے جب ملک بھر میں

''ہندی چینی بھائی بھائی کے نعرے ہر زبان پر تھے۔ مگر کسے علم تھا دوستی کا یہ ہاتھ چین کی

مکاری اور پرفریب سیاسی چال تھی۔ راز اس وقت فاش ہوا جب اسی نے اپنے ناپاک قدموں سے گوتم اور چشتی کی مقدش دھرتی کو جس کا "ہر ذرہ دیوتا ہے" ناپاک کرنے شازش رچائی تھی۔ اس موقع پر جاں نثار کے یہ شعر ملاخط ہوں۔

جو کل کو اگر آئے چاؤ یا ماؤ
لگادیں گے ہم زندگانی کا داؤ
ہمارا ہے کشمیر نیفا ہمارا
کبھی جھک سکے گا نہ جھنڈا ہمارا
ذرا دیس کے دشمنوں سے یہ کہد و
میرا دیس آزاد ہوکر رہے گا

مناظر قدرت کے مصوری پر انھیں یدطونی حاصل ہے۔ اگر ہجر رسیدہ یا فراق زدہ کی نگاہ میں یہ سارے مناظر کیا ہیں ملاخطہ کیجئے۔

یہ ستارے یہ کفن کے سرد پھول
چاند جیسے ایک بے امت رسول

بے امت رسول نادرالوجود تشبیہ ہے۔ ستاروں کو کفن کے پھول کہنا نہایت متنوع خیال

ہے۔

اور جب یہی شاعر مئے وصال سے سرشار ہوتا ہے ان لمحات میں پوری کائنات گنگناتی اور رقص کرتی محسوس ہوتی ہے۔

یہ دل اور ان کی نگاہوں کے سایے
مجھے گھیر لیتے ہیں بانہوں کے سایے
لپٹے یہ پیڑوں سے بادل گھنیرے
یہ پل پل اجالے یہ پل پل اندھیرے
بہت ٹھنڈے ٹھنڈے ہیں راہوں کے سایے
یہ دل اور ان کی نگاہوں کے سایے
پہاڑوں کو چنچل کرن چومتی ہے
ہوا پر ندی کا بدن چومتی ہے
یہاں سے وہاں تک ہیں چاہوں کے سایے
یہ دل اور ان کی نگاہوں کے سایے

اختر کے گیتوں میں فکر ونظر کی گہرائی رس۔ سوز اور ساز۔ لطافت و پاکیزگی ہے۔ گیتوں کا سوتی آہنگ شیرینی اور گھلاوٹ دل پر اثر کرتی ہے۔ سیاسی اور سماجی مسائل کی ترجمانی لایق ستائش ہے ساحر کے گیتوں پر جاں نثار نے جس رائے کا اظہار کیا ہے وہ بعینہ خود ان کی گیتوں پر

صادق آتا ہے۔

''اس نے فلموں کو ایسے گیت دیئے جو سیاسی اور سماجی شعور سے لبریز ہیں یہ ایک بڑا قدم ہے جو ساحر نے دلیری سے اٹھایا ہے۔ وہ ہمارے بعض شاعروں کی طرح فلمی دنیا کے گندگی میں ڈوب کر نہیں رہ گیا۔ بلکہ اس نے اپنے قلم کی قوت سے فلمی گیتوں کو ایک طرف حسن کی لطافت اور نزاکت اور عشق کا درد اور کسک بخشی تو دوسری طرف سماجی مادی اقتصادی شعور دیا۔ اس نے نہ خود کو دھوکا دیا نہ اپنے فن کو نہ ترقی پسند تحریک کو نہ عوام کو۔ اس نے وہ کیا جو ایک بیدار شاعر کا فرض تھا۔''

[۱]

---

[۱] ساحر اور اس کی شاعری ص ۱۲۴ جاں نثار اختر

رباعی

رباعی:۔ ربع عربی میں چار کو کہتے ہیں۔ چونکہ رباعی میں معینہ طور پر حرف چار مصرعے ہوتے ہیں اس لیے اسے رباعی کہا جاتا ہے۔ رباعی کی عروضی حیثیت بہت ہیں نمایاں ہے اس کا پہلا دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے۔ موضوع کی ابتدا پہلے مصرعہ سے ہوتی ہے دوسرے اور تیسرے مصرعے میں اس کی وضاحت ہوتی اور چوتھا مصرعہ حاصل کلام ہوتا ہے یہی آخری یا چوتھا مصرعہ رباعی کی جان ہوتا ہے۔ اس کی صنائی جامعیت اور بلاغت ہر رباعی کی عمدگی کا دارومدار ہوتا ہے۔ اس کی ایجاد کے بارے میں بہت سی روایت ہیں۔ جن میں بیشتر نامکمل یا غیر معتبر ہیں اور یہ کہ ان روایات کی بنیاد پر رباعی کا ایجاد کے صحیح دور کا تعین کرنا ممکن نہیں ہے بقول ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی..

''کسی روایت سے یہ بات واقع نہیں ہوئی کہ یعقوب صفاریہ کے بچے کا واقعہ کسی سنہٗ کا ہے صرف اس قدر مصدقہ ہے کہ دولت صفاریہ میں اس کا نام بجائے رباعی کے دوبیتی تھا۔ مگر رباعی کے مقابلے میں دوبیتی کو شہرت نصیب نہ ہوئی اور رباعی رباعی میں مشہور ہوئی۔'' [۱]

رباعی سے ملتی جلتی صنف (چار مصروں والی) دنیا کے دوسرے ادبوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ ہندی میں رباعی کو مکتک یا چتش پری کہتے ہیں۔ ہندی میں اردو یا فارسی کی طرح اس کے اوزاں نہیں مقرر ہیں۔ سنسکرت میں اس طرز شاعری کی چار چرن یا مکتمک کہتے ہیں۔ سنسکرت میں بھی اس کے اوزاں متعین نہیں ہیں۔ پشتو میں دوبیت اور انگریزی میں کوایٹرن کہتے ہیں۔

''اردو میں جس طرح غزل قصیدہ فارسی سے آکر رائج ہوئے اسی

---

[۱] جگت موہن لال رواں حیات اور ادبی خدمات ص ۱۲۰ ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۸۴ء

طرح رباعی بھی فارسی کی ہی دین ہے رباعی ہر دور میں لکھی گئی لیکن دور جدید قبل شعرا نے دلچسپی اور لگن سے اسے نہیں اپنایا تھا۔ یہ دیوان کی تکمیل کی خاطر بارشبہ میں پیش خوانی کے لیے جگہ پاتی رہی۔ پھر بھی ان کے لکھنے کا رواج عہد قدیم سے عہد حاضر تک برابر رہا ہے اردو رباعی کے قدیم ترین نمونے دکن ہندوستان میں ملتے ہیں۔ تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ ریاست گولکنڈہ کا مشہور حکمراں قلی قطب شاہ (۱۵۶۲ء۔ ۱۶۱۱ء) اردو کا پہلا رباعی گو شاعر تھا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سلام سندیلوی لکھتے ہیں ''موجودہ تحقیق نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ اردو کا پہلا رباعی گو شاعر محمد قلی قطب شاہ ہے'' [۱]

دکن میں محمد قلی قطب شاہ کے علاوہ بھی شعرا نے رباعیاں کہی ہیں لیکن چونکہ ان کی ادبی حیثیت مسلم نہیں ہے اسی لیے ان کے ذکر سے اجتناب کیا جاتا ہے۔

شمالی ہند کے شعرائے سلف کے سرمایہ شاعری کے جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان شعرا نے بھی کوئی خاص توجہ رباعی کی طرف نہیں دی ہے۔ میر (۱۷۲۲ء۔۱۸۱۰ء) اور سودا (۱۷۱۳ء۔ ۱۷۸۰ء) کے زمانے میں محض چند شعرا نے رباعیاں کہی ہیں۔ ان کی زیادہ تر توجہ دوسری اصناف کی طرف ہی مائل رہی ہے۔ لیکن چونکہ اس دور کے رباعی گو شعرا تعداد میں زیادہ ہیں۔ ان کے سرمایہ کلام کی بہتات کی روشنی میں اسے اہمیت دی جاسکتی ہے۔ اس دور میں۔ درد۔ میر۔ سودا۔ غمگین ہوز۔ تاباں حسرت اور قائم وغیرہ کے نام رباعی کہنے والوں میں اہمیت

---

[۱] کعبہ میں صنم خانہ ص ۲۴ ڈاکٹر سلام سندیلوی نسیم بکڈپو لکھنؤ ۱۹۶۶ء

رکھتے ہیں۔ اور ان کی رباعیاں بھی گو ناگوں محاسن کی حامل ہیں۔ عہد مصحفی (۱۷۵۰ء۔ ۱۸۲۴ء) اور انشا (۱۷۵۶ء۔ ۱۸۱۷ء) بھی اردو رباعی کے حق میں بہتر نہیں کہا جا سکتا صرف مصحفی کی رباعیاں معیار اور تعداد دونوں لحاظ سے اچھی ہیں جبکہ اس عہد کے دوسرے شعرا کی رباعیاں فن اور ادبی محاسن سے محروم ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کے دور (۱۷۷۵ء۔۱۸۶۲ء) میں جب کہ اردو شاعری کا نیز اقبال چرخ چہارم پر تھا اس دور میں بھی رباعی شعرا کی عدم توجہی کا شکار رہی۔

لکھنوی و بستانی شاعری کے دو نامور اساتذہ آتش (۱۱۹۲۔۱۲۶۳ء) و ناسخ (۱۱۷۱۔ ۱۲۵۴ء) کے ہاتھوں میں عروس رباعی اپنے گیسو پوری طرح نہ سنوار سکی۔ پھر بھی آتش کے مقابلے میں ناسخ نے اس کی طرف ذرا زیادہ توجہ دی لیکن وہ بھی غزل کے مقابلے میں صفر کے برابر تھی۔ لیکن لکھنؤ کے ہی دو نامور مرثیہ گو یوں میر انیس (۱۷۹۹ء۔۱۸۷۴ء) اور مرزا دبیر (۱۸۰۳ء۔ ۱۸۷۵ء) نے بلاشبہ نہایت اہم اور قابل قدر رباعیاں کہی ہیں............اسی ضمن ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ....

"دراصل اردو رباعی کو پورا پورا عروج دور جدید ہی میں حاصل ہوا اسی عہد میں شعرا کی ایک بڑی تعداد نے دلچسپی اور توجہ کے ساتھ رباعی کو اپنایا اور ہر موضوع پر رباعیاں کہہ کر اردو شاعری کے دامن کو اس صنف کے بیش قیمت موتیوں سے بھر دیا۔ اس دور میں اکبر۔ حالی۔ شاد۔ سرور جہاں آبادی۔ عبدالباری آسی۔ یگانہ چنگیزی۔ سیماب۔ امجد۔ جوش۔ فراق۔ رواں۔ ساغر۔ جاں نثار اختر نے

لایق قدر رباعیاں کہی ہیں۔'' [۱]

اس سلسلے میں ڈاکٹر سلام سندیوی کا قول کافی اہم ہے وہ لکھتے ہیں۔

''دور جدید رباعیات کی تخلیق کے اعتبار سے عہد زریں کہا جا سکتا ہے'' [۲]

جوش رباعی کے ایسے شاعر تھے جو پورے طمطراق سے فراق سے پہلے اس مختصر اور مشکل ترین صنف کی طرف رجوع ہوئے جوش بنیادی طور سے نظم کے شاعر تھے اور فراق غزل کے اس لیے ان کے شدا رباعی برتنے کے انداز (Treatment) میں فرق ملتا ہے۔ جوش کی رباعیوں میں خانہ دار عورت کا حسن چمکتا ہے لیکن وہ حسن کی جواں سال ساعتوں کے پجاری ہیں۔

یہ چاند کا گھیرا ہے تیرا مکھڑا
فردوس کا ڈیرہ ہے کہ تیرا مکھڑا
جنگل کی یہ راتیں ہیں کہ تیری زلفیں
پربت کا سویرا ہے کہ تیرا مکھڑا

اس کے باوجود جوش کے یہاں فراق کی ایسی جرأت نظارگی نہیں ہے وصل کی نشاط انگزیوں میں ان کے یہاں ایسی تصویریں بھی ابھر آئی ہیں جوان کے ہیجانی کیفیت اور جنس زدگی کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اساتذہ قدیم کے یہاں رباعی میں پختگی عمر کے تجربات کی عکاسی کا

---

[۱] جگت موہن لال رواں حیات اور ادبی خدمات ص۱۲۴ ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۸۴ء

[۲] اردو رباعیات ص ۶۳ ڈاکٹر سلام سندیلوی نسیم بکڈپو لکھنؤ

احساس ہوتا ہے جوش اس توازن کو برقرار نہ رکھ سکے۔

یہ رات گئے تیری جماہی توبہ
ہلچل میں یہ آنکھوں کی سیاہی توبہ
اعضا کا یہ پیچ و تاب اللہ غنی
یہ نیند کے جھوکے الٰہی توبہ

فراق نے بھی وصل کے خاص موقوں کا ذکر کیا ہے لیکن ان کے یہاں ہیجان نہیں بلکہ
ایک خاص قسم کی سیرابی ہے آسودگی اور اطمینانی ہے۔

جب تاروں نے جگمگاتے نیزے تولے
جب شبنم نے فلک سے موتی رولے
کچھ سوچ کے خلوت میں بصد ناز اس نے
نرم انگلیوں سے بند قبا کے کھولے

فراق نے ہندو اساطیر جمالیات سے کام لیکر رباعی کے میدان میں ایک نیا رنگ و
آہنگ پیدا کیا۔ رباعی جو ابھی تک فارسی کی ذکر پر گامزن تھی۔ فراق نے اس سے گریز کیا۔
انھوں نے ہندوستانی عورت بالخصوص ہندو عورت کو موضوع بنایا خواہ وہ عورت گائے دوہ رہی ہو

یا پنگھٹ سے پانی کی گگریاں لا رہی ہو۔ یا صحن میں بیٹھی رامائن کا پاٹھ کر رہی ہو ہر حال میں عورت ان کی مرکز نگاہ رہی ہے۔

وہ گائے کا دوہنا سہانی صبحیں
گرتی ہیں بھرے تھن سے چمکتی
گھٹنوں پہ کلس کا وہ کھنکنا کم کم
یا چٹکیوں سے پھوٹ رہی ہوں کرنیں
پنگھٹ میں گنگریاں چھلکنے کا یہ رنگ
پانی ہچکولے لے لے کے بھرتا ہے ترنگ

گاڑھوں یہ سروں پہ دونوں باہنوں میں کلسی
دانگھیوں میں سینوں میں بھرپور امنگ

اسی قبیل میں شامل رواں اناوی کا نام بھی شامل ہے۔ رواں کی رباعیات میں خیانت کی بلندی پیش کی چستی طرز ادا کی جدت نازک تشبیہات اور حسین استعارات موجود ہیں ان کی رباعیات میں ایک خاص قسم کی روانی اور ترنم ہے رواں کی خاص موضوع فلسفہ ہے۔ لیکن فلسفہ کی آمیزش نے ان کی رباعیوں کو بے کیف نہیں ہونے دیا ہے ڈاکٹر سلام سندیلوی لکھتے ہیں۔

''ان کی فلسفیانہ اور حکیمانہ رباعیات کا اندازِ بیان وہی ہے جو خیام کا ہے'' [۱]

---

[۱] اردو رباعیات ڈاکٹر سلام سندیلوی ص ۲۶۰ مطبوعہ نسیم بکڈپو لکھنؤ

ڈاکٹر سلام سندیلوی آگے لکھتے ہیں

''افسوس کی رواں کی عمر نہایت تیز گام ثابت ہوئی اور پینتالیس کی عمر میں حیات کی مختلف منازل طے کر کے عالم ارداح کو پہونچ گئی ورنہ اس بلند پایہ شاعر کی تخیل خیام کی روح کو ضرور چھو لیتی پھر بھی اس میں شک نہیں کہ رواں کی رباعیات میں خیام کی آواز کی ہلکی سی تھرتھراہٹ موجود ہے'' [۱]

اس تناظر میں رواں کی یہ رباعی دیکھئے حسن میں خیام کا خمار موجود ہے۔ حالانکہ تعداد ایسی رباعیوں کی کم ہے لیکن کیف وسرور ان میں بدرجہ اتم ہے۔

نوروز ہے غرق بادۂ دنیا کردے
میرا ارمان آج پورا کردے
پی لوں میں شراب بھر کے اس میں ساقی
تو کاسئہ آسمان کو سیدھا کردے

ترقی پسند شعرا میں بہتوں نے رباعیاں کہی ہیں جاں نثار اختر بھی ان میں سے ایک ہیں شروع میں جاں نثار نے قطعات اور رباعیات بڑی تعداد میں کہیں جو ان کے مجموعوں میں شامل ہے۔ ان کی موجودہ دور کی کہی رباعیاں اور قطعات ایک خاص موضوع پر ہیں اور یہ موضوع ہے

---

[۱] اردو رباعیات ڈاکٹر سلام سندیلوی ص ۴۶۰ مطبوعہ نسیم بکڈپو لکھنؤ

ازدواجی زندگی۔اس سلسلے میں جاں نثار اختر کا یہ خیال درست ہے کہ اردو کی رومانی شاعری میں رومان یا تو محبوبہ کے وصل پر ختم ہوتا ہے یا اس کی جدائی پر۔عورت کا تصور بحیثیت شریک حیات بہت نایاب ہے یہ بات صرف اردو زبان کے شاعروں پر موقوف نہیں دنیا کی دوسری زبانوں میں عموماً شعرا کے لیے گھر کے باہر کی ہی فضا ساز گار رہی اور شعرا نے کبھی صحرا بہ صحرا کو بہ کو۔کبھی کنار آب جو اور کبھی بازار حسن میں اس کے روپ کو دیکھا اور اسے موضوع بنایا لیکن گھر کی عورت کو اس نے درخور اعتنا نہیں سمجھا یا بقول کشش ''گھر کی مرغی دال برابر'' سمجھ کر اس میں کوئی رنگین حسن یا کشش اور دل فریبی نظر نہیں آتی۔البتہ سنسکرت یا ہندی لوک گیتوں میں عورت کے خدوخال ابھارے گئے۔اور اس کے نازک ترین جذبات کی عکاسی کی گئی ہے۔مثلاً فراز حامدی کے گیت کا یہ بند۔

آنگن مور سے کر جاں گائے
کوٹھے بیٹھا کا گا بولے
ساس نند سے آنکھ بچا کے
کہے یہ اس سے ہولے ہولے
اڑجا رہے کا گا پیو گھر آئیں
سونے میں چونچ منڈھاؤں توری
یہ ہے گاؤں کی گوری

اس طرح فراق نے سنسکرت کے سنگھار رس کو اردو رباعی کے لئے تاب میں اس طرح ختم کر دیا ہے کہ اس نوکشید شراب کو دیکھ کر زاہدوں کا بھی وضو ساقط ہو جاتا ہے۔ جاں نثار اختر اور فراق کی رباعیوں کا انداز ایک سا محسوس ہوتا ہے اور ڈاکٹر جمیل جالبی کا یہ تجربہ درست ہے کہ......

"جاں نثار اختر اور فراق کی رباعیوں کے کرداروں کے آپسی رشتے کی سطح تو ایک سی ہے۔ لیکن زندہ ماحول اور مشاہدات نے گھر آنگن کی رباعیوں میں موجود عہد کے زمین و آسمان کو نمایاں طور سے ابھارا ہے" [۱]

شیام موہن لال جگر بریلوی نے ہندوستانی گھریلو عورت کو موضوع بنایا۔ اور اپنی اسی پیش کش میں اہلیہ کے روپ ایک آدرش ناری आदर्श नारी تصویر پیش کی ہے۔

جان نثار ایک نئی شکل میں عام ڈگرے ہٹ کر اپنی رباعیوں میں نظر آتے ہیں انہیں ہندوستان کی ہر چیز سے لگاؤ ہے یہاں کی تہذیب اعلیٰ ترین تہذیبی اور معاشرتی روایات امن پسندی اور یہ کی یہاں کی زبان ان کو دل سے پیاری ہے ان سب کا مجموعہ ان کی گھر آنگن کی شاعری میں پوری طرح جلوہ گر ہے وہ مضطر خیر آبادی کے بیٹے تھے۔ اور مضطر ہندی شاعری میں ایک بلند درجہ پر فائز تھے........ مضطر کی شاعری کا یہی رس جاں نثار کو ورثہ میں ملا تھا جو ان کے خیالوں اور احساسات کی بنیادی اساس ہی جس کا انوکھا روپ ان کی شاعری میں ابھرا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ان کی رائے میں...

---

[۱] فراق کی رباعیاں ص ۲۹۱ از جمیل جالبی مشمولہ ماہنامہ شاہکار فراق نمبر

''میرا خیال ہے کہ جو شخص ہندوستان میں پیدا ہو کر ہندی شاعری
سے متاثر نہیں ہوتا اس کا احساس شعری مردہ ہے'' ؎۱

خود عورت کی زبان سے اس کے جذبات دلی کا شاعرانہ اظہار جاں نثار کی شاعری کی شناخت بن چکا ہے کرشن چندر نے گھر آنگن کے دیباچے میں اپنی دوسری رائے کے اظہار کے ساتھ یہ ٹھیک ہی کہا ہے۔

''گھر آنگن میں البیلے شاعر کی قوت مشاہدہ گہری نفسیاتی گرفت اور
زبان بیان کی حلاوت جس میں ہمارے دیش کے کلچر کی سوندھی خوشبو
رچی ہوئی ہے'' ؎۲

حالانکہ جاں نثار نے جداگانہ طور پر ہندی میں شاعری پیش کی لیکن ہندی الفاظ کے نگینوں سے اپنے اشعار کو سجاتے رہے ہیں اور فلمی دنیا میں آنے کے بعد ان کی یہ صلاحیت اور نمایاں طور پر ظاہر ہوئی۔

جاں نثار کی شاعری میں ازواجی زندگی کے تجربات اور شاہدات کا عکس محسوس ہوتا ہے بیان کی صداقت اس کی اثر آفرینی کا موجب ہوتا ہے۔ یہ کہنا بجا طور پر درست ہے کہ جاں نثار کی گھر آنگن کی شاعری اس غزل سے شروع ہوتی ہے۔ جس پر پہونچنے میں اکثر شعرا کے طائر فکر کے پر پرواز شل محسوس ہوتے ہیں۔ جاں نثار یہیں سے آگے کے لیے اڑان بھرتے ہیں۔

مجموعی طر سے گھر آنگن کی شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(ا) ایسے قطعات اور رباعیاں جو شاعر کی زبان سے کہی گئی ہیں

؎۱ مضطر ہندی شاعری حیثیت سے از جاں نثار اختر علگیڈھ میگزین ۱۹۳۶ء ص ۳۹
؎۲ گھر آنگن دیباچہ از کرشن چندی

(۲) وہ قطعات اور رباعیاں جو عورت کی زبان سے کی گئی ہیں۔

ایک برہ کی آگ میں سلگتی عورت کو جب ساجن کے پردیس سے گھر آنے کی خبر لگتی ہے۔ وہ خوشی میں ڈوب کے اور ساری سدھ بدھ کھو کے اپنی پتی دیو کے سواگت کی تیاریاں شروع کر دیتی ہے۔ خود اپنے سجنے سنوارنے کے خیال سے زیادہ شوہر کی آسائش کا خیال ہوتا ہے۔

وہ آئیں گے تو چادر بچھا دوں کی گوری
پردوں کی ذرا اور بھی کس دوں ڈوری
اپنے کو سنوارنے کی سدھ کھو کر
گھر بار سجانے میں لگی ہے گوری

یہ عورت کی فطرت ہے جسے وہ چاہتی ہے اسے کوئی دوسرا نہ چاہے۔ اکثر اس کی یہ محبت حد کی منزلوں تک بھی پہونچ جاتی ہے۔ حد یہ کہ وہ غیر مادی اشیاء کی نظر سے بھی اپنے محبوب کو بچائے رکھنا چاہتی ہے۔

ہر چاندنی رات اس کے دل کو دھڑکائے
بھولے سے کھڑکیوں کے پردے نہ بنائے
ڈرتی ہے کسی وقت کوئی شوخ کرن

چپکے سے نہ اس کے پاس آکے سوجائے

بیوی کے تیاگ کا یہ منظر ملاحظہ ہو۔

کپڑوں کو سمیٹے ہوئے اٹھی ہے مگر
ڈرتی ہے کہیں ان کو نہ ہوجائے خبر
تھک کر ابھی سوئے ہیں کہیں جاگ نہ جائیں
دھیرے سے اڑھارہی ہے ان کو چادر

گھریلو زندگی کے حسین مشاہدات جن سے شاعر کے جمالیاتی ذوق کی تسکین ہوتی ہے
ملاحظہ ہو۔

نظروں سے میری خود کو بچالے کیسے
کھلتے ہوئے سینے کو چھپالے کیسے
آٹے میں سنے ہوئے ہیں دونوں ہاتھ
آنچل کو سنبھالے تو سنبھالے کیسے

''اس طرح بیوی کی زبان سے جو تاثرات پیش کیے ہیں ان میں

بھی ازواجی زندگی کی رعنایاں اور ہندوستان کی قدیم تمدنی روایت کو جھلکیاں موجود ہیں۔ بقول ندافاضلی ''متوسط طبقے کے ایک بھارتیی پریوار کے کے سکھ دکھ کی منظوم جھانکی جسے رومانی رنگوں سے سجایا گیا ہے۔'' [۱]

ایک سہیلی سے ہم کلامی کا اندازہ دیکھئے۔

فکروں سے اتر گئی صورت ان کی
الجھی ہوئی رہتی ہے طبیعت ان کی
آئے گی سکھی کہاں سے ہمت ان میں
میں ہی نہ بندھاؤں گی جو ہمت ان کی
میں ان کا سکھی ہاتھ بٹا سکتی ہوں
حالات کو ہموار بنا سکتی ہوں
وہ بوجھ اٹھائیں گے اکیلے کب تک
میں خود بھی تو کچھ بوجھ اٹھا سکتی ہوں

گھریلو زندگی کا موضوع نہایت وسیع ہے اس زندگی میں ہر وقت نئے مناظر نئے مشاہدات تجربات کی جاذب نظر تصویریں نگاہوں کے سامنے آتی رہتی ہیں۔۔۔۔۔جاں نثار

[۱] گھر آنگن پر تبصرہ ازندافاضلی روزنامہ انقلاب بمبئی

کی قوت مشاہدہ نے رس میں ڈوبی زبان میں ان کی نفسیاتی گرفت کی ہے۔ان رباعیوں میں ہمیں زندگی کی سچائیاں۔گھریلو فضاؤں کی دلفریباں اور رومانی برائیاں نظر آتی ہیں۔بعقول شہاب مالیدکوٹوی...

''اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ شعرادب ارٹ یافن۔پیرایہ بیان محبت خلوص یااس وفا انسانیت ازواجی زندگی کی برکات اوراس کی گراں بارذمہ داریاں اوران کو بجالانے میں طرفین کے احساسات اور باہمی خودداریوں کے خیال کا یہ عالم کہ کہیں ''ٹھیس نہ لگ جائے آنگیوں کو'' پھر روایت کے احترام کے ساتھ روایت پردیدہ ورانہ تنقید ترقی پسندی کا جاذب نظررخ بول چال کے لفظوں میں کیسے ہوتی ہے تو میں عرض کردوں گا کہ تنہائی میں ''گھر آنگن'' کو پڑھئے'' [1]

جاں نثار نے جہاں مرد کے جذبات کی عکاسی ہے وہاں انھوں نے اسی سچائی کے ساتھ عورت کے جذبات کی بھی ترجمانی کی ہے اس کی غم وحسرت کی داستان بھی وہی ہے جوصرف تجربہ کی آنچ میں تپ کر ہی نکلی ہے۔اسی منزل پر جاں نثار کی قوت مشاہدہ کا ادراک ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سیفی پریمی سچ ہی کہا ہے.....

''شب زماف لے کر بازاری خریداری اشیا تک اپنی اہلیہ کے گونا گون انداز کا عمیق مطالعہ کیا ہے۔عورت کے ان گنت روپ پر نظر جمی ہے مثلاً آنگن میں دہرا آنچل۔عالم فراق میں انتشار ذہنی کے باعث

---

[1] نقد ونظر از شہاب مالیدکوٹوی ص ۸۰ ماہنامہ شاعر ممبئی

ہاتھ سے برتن کا گر کر ٹوٹنا۔ بیداری کی تمنا پر الجھن۔ سنگر مشین چلاتے
وقت حسن کی محویت۔ سوئٹر بننے میں سلائی اور سوچ کا لمحہ نئی خریداری
پر خوشی کا جذبہ اور شوہر کی خریداری اشیاء فضول خرچی کا اعلان
دوسروں سے شوہر کی برائی سننے کی تاب نہ لانا کفایت شعاری سے گھر
کو آسودہ بنانا ہر لمحہ شکست پر شوہر کی رفاقت اور حوصلہ افزائی رات کو
مدہوش پیا کے لیے زنجیر در کھولنا اور شمع کی طرح گھر میں ساتھ آنا
وغیرہ۔'' [۱]

ان تمام اوصاف کے ساتھ ساتھ گھر آنگن کی رباعیوں میں خواہش اور کیفیت وصل کے اظہار میں فراق کی طرح کھیل کھیلے ہیں اور کہیں کہیں تو ان کی شوخ بیانی حد سے تجاوز ہوکر ابتدال کے رنگ میں ڈوبی نظر آتی ہے مثلاً ہر آن وہ ہوتی ہوئی پلکیں بھاری'' میں کیفیت وصل کا اظہار بے پردہ ہوگیا ہے حالانکہ یوسف ناظم کا خیال ہے کہ شاعر نے ہر لمحہ گذاری کو الفاظ کے جال میں قید کرلیا ہے اس میں عورت کا وہ روپ نہیں جو آج لیڈی آف دی ہاوس Lady of the House کہلاتی ہے بلکہ اس سیدھی سادھی عورت کا عکس ہے جو شوہر کی محبوب بیوی ہمدم رفیق اور غم خوار ہے۔''

مجھے ان کے تجربے سے اتفاق ہے لیکن حظ وصل خواہ بازار حسن کی عورت سے حاصل کیا جائے یا بیوی سے۔ ابتدال دونوں مرحلوں پر ابتدال ہی کہا جائے گا مختصر یہ کہ گھر آنگن میں جگر بریلوی کا رس اور فراق کا روپ دونوں موجود ہیں خود فراق کا فیصلہ ہے.....

---

[۱] گھر آنگن پر تبصرہ ماہنامہ کتاب نما دہلی ص ۱۰

''یہ ایک با کمال شاعر کا ایسا مجموعہ ہے جس میں ہندوستان کے تقریباً پندرہ کروڑ اور گھریلو زندگی کی نرم و نازک تصویریں دکھائی گئی ہیں۔ ان رباعیوں میں ادھ کھلی کلیوں اور ان کی بھینی بھینی خوشبوؤں کی صفت رچی اور بسی ہوئی ہے۔ ہندوستان کے تمام لوک گیتوں کی گونجیں اور جھنکاریں رہ رہ کر سنائی دیتی ہیں۔ ان رباعیوں میں ایک کنوارا پن ہے جسے ہم کسی موہنی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ کنوارے پن کی یہ تازگی ان رباعیوں کی سدا بہار اور سرا سہاگ بنا دیتی ہے گھر اور آنگن ہندوستانی تہذیب کے ہنڈولے ہیں انھیں پالنوں میں یہ رباعیاں ہلکے ہلکے جھولے لے رہی ہیں۔ ایسی شاعری ہمارے لوک گیتوں میں بھرپور انداز سے پیش کی گئی ہے۔ بلند اور شاندار ادب میں یہ موضوع اور اس کے ہزاروں پہلو سورداس کے پدوں میں دکھائے گئے ہیں۔ جاں نثار نے یہی نعمت ہمیں ان رباعیوں میں دے کر ہم پر سب سے بڑا احسان کیا ہے'' [۱]

---

[۱] گھر آنگن پر تبصرہ ماہنامہ کتاب نما دہلی ص ۲۹

(باب پنجم)

جاں نثار اختر بحیثیت نثر نگار

اس حقیقت سے کم ہی لوگ آشنا ہیں کہ جاں نثار اختر نے رومانی اور انقلابی شاعری کے علاوہ لطیف سادہ اور پر وقار نثر بھی لکھی ہے۔ وہ ایک خوش فکر شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب طرز نثر نگار اور بلند پایہ نقاد بھی تھے۔ ان کی تحریر انتہائی سلیس اور انداز بیان واضح پر زور اور شگفتہ ہے شعر و ادب کے بارے میں جاں نثار کے نکات لطیف اور بصیرت افروز ہوتے ہیں۔ غیر متعلق بحثیں چھیڑ کر وہ نفس مضمون کو ناقص و مجروح نہیں کرتے۔ بلکہ شعر و ادب کے مسائل سے پورے استدلال کے ساتھ بحث کرتے ہیں وہ جو لکھتے ہیں بے لاگ اور وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں۔ حالانکہ نقد و نظر کے موضوع پر ان کی باقاعدہ کوئی تصنیف نہیں ہے لیکن ان کے اداریے مختلف کتابوں کی تقریظ اور دیباچے تقاریر اور خطوط ان کی نثر نگاری کا لازول سرمایہ ہیں۔

غالب نے اپنے خطوط کے حوالے سے مراسلہ کو مکالمہ ضرور بنا دیا ہے۔ جاں نثار اختر نے بھی اس رنگ و آہنگ سے آمیز کر کے صفیہ اور خدیجہ کو لکھے گئے اپنے خطوط کو غبار خاطر (ابو الکلام آزاد) اردوئے معلیٰ اور عود ہندی (غالبؔ) کے دوش بدوش کھڑا کرنے کی ضرور کوشش کی لیکن ان کے جذبات کی سوزش اور ابال نے بعض مقامات پر اسے شباب اور شراب میں ایسا غرق کیا کہ جوش کی طرح اکثر خطوط میں دامن متانت پر اپنی گرفت مضبوط نہ رکھ سکے پھر بھی ان میں بہتات ایسے خطوط کی ہے جن کی ادبی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اگر ان کی جستہ جستہ اقتباسات یکجا کیے جائیں۔ تو بہت کچھ ان کی زندگی کا عکس اور ان کے نظریات و عقائد کو نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے اپنے اکثر خطوط میں وہ مغربی منکرین اور دانشوروں کے جملے Quatation پیش کر کے اپنے قول کا استحکام عطا کرتے ہیں۔ مثلاً ۲۳ اگست ۱۹۰۴ء کو خدیجہ کو

لکھے گئے ایک خط میں برٹرنڈ رسل کا یہ جملہ دہراتے ہوئے محبت میں بے احتیاطی کو مذموم قرار دیئے ہیں۔ ''all forms of caution cation in love is worst''

''ہر طرح کی احتیاطوں میں بدترین وہ احتیاط ہے جو محبت میں اپنے اوپر عاید کی جائے''۔[۱]

اختر کو اپنے غریب الدیار ہونے کا از حد قلق تھا۔ ۲۸ر جولائی ۱۹۴۴ء کو صفیہ کے ایک خط میں اس طرف یوں اشارہ کرتے جوان کی وطنی الفت کا غماز ہے۔

''علیگڈھ میں کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی تو بہت ممکن ہے کہ یہاں کی ملازمت میں اس حال میں بھی چھوڑ دوں پھر دیکھا جائے گا۔ صفیہ اب میرے لیے قطعی قابل برداشت ہے۔ غربت کی آرزو وطن کی محبت پر غالب آرہی ہے مجھے ذرا بھی ذہنی سکون نہیں یہ میں جانتا ہوں کی میر اس طرح ملازمت ترک کر کے نکل کھڑا ہونا عقلمندی کی بات نہ ہوگا۔ لیکن پھر بھی دل کو تنہا چھوڑنے کے سوا اور کچھ بنتا نظر نہیں آتا ہے۔۔

ستایا یار نے ایسا کہ ہم وطن سے چلے

یہ مصرعہ میں غم روزگار کو غم جاناں بنانے کے شوق میں نہیں لکھا بلکہ اس میں کچھ حقیقت بھی ہے۔ اور وہ حقیقت کیا ہے اس کا اظہار کسی مکتوب میں نظر نہیں آتا ہے۔

۱۴ر اگست ۱۹۵۴ء کو خدیجہ کے نام لکھے گئے خط میں ان کے وسیع مطالعہ دوسرے ملکوں

---

[۱] خاموش آواز ص ۵۴ جاں نثار اختر مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی بھوپال ۱۹۸۱ء

کے ادیبر ان کی نگاہ ان کی مثبت نگارشات پر ان کے عقاید کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔

''نہیں میری دوست مجھے بری باتیں چھوڑ کر تم سے اچھی باتیں کرنی چاہیں۔ دیکھو میں نے کل تمھارے لیے دو کتابیں خریدیں ہیں (۱) الیہ کیو کی سچی کہانیاں اور (۲) زندگی کی لہر۔ یہ دونوں چینی ادب کی بڑی اہم Ficion ہیں۔ کیونکہ کی سچی کہانی چین کے عظیم ترین مصنف لوہوں کی لکھی ہوئی ہے اس کے بارے میں تم اس کتاب کے دیاچے میں بہت کچھ پڑھ لوگی۔ مجھے تو صرف اتنا لکھنا ہے کہ دیکھو لوہوں نے کسی فنی چابکدستی کے کردار کو پیش کیا ہے اور کس طرح چین کے ۱۹۱۱ء کے ناکامیاب انقلاب کہ بطور پس منظر استعمال کیا ہے۔ الیہہ کیولوہوں کی کردار نگاری کی عظیم مثال ہے۔ Engils نے لکھا تھا۔

Realishm to my mind impliss besides truth of batte the truth ful reprection of charactor under by picla cercumtred

اس جملے کی روشنی میں تم اس کتاب کی پڑھو حقیقت یہ ہے کہ چینی ادب میں حقیقت نگاری کا سنگ بنیاد رکھنے والا لوہوں ہی تھا۔ اس کا نام دنیا کے بڑے ادیبوں میں شمار کیا جاتا ہے اور وہ آج مر کر بھی زندہ ہے

دوسری کتاب چین کی مشہور خاتون ساونگ کی تصنیف Moving force کا ترجمہ ہے۔ یہ چین میں جمہوری انقلاب کے بعد لکھی ہوئی

ناول ہے اس ناول سے انھیں چینی مزدوروں کی محنت اور نئے چین کو
سنوارنے کے لیے ان کی لگن کا اندازہ ہوگا۔ پوری ناول کا مرکز ایک
بجلی کا کارخانہ ہے۔ ایسے خشک موضوع پر اتنا جاندار ناول جہاں تک
میں نے اس طرف روسی ناول پڑھے ہیں وہاں بھی نہیں لکھا گیا۔ جو
لوگ جدید ادب کو پروپیگنڈہ کہتے ہیں وہ محض اس لیے تو کہتے ہیں کہ
ان چیزوں میں جذباتی اور نفیساتی عناصر کی آمیزش نہیں ہوتی اور نہ
جمالیاتی اقدار کا خیال رکھا جاتا ہے اور یہ بات غلط نہیں کہ اگر ان
باتوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو وہ ادب ادب نہیں رہ جائے گا۔
پروپگنڈہ کہلانے کا مستحق ہوگا تم اس ناول زندگی کی لہر کو پڑھو۔ اور تم
اسے پروپیگنڈہ ہوتے ہوئے بھی پروپیگنڈہ نہیں کہوگی۔''[۱]

۲۴ اگست ۱۹۰۴ء کو خدیجہ کے نام محررہ خط ان کی حب الوطنی اور خاک وطن کے ہر
ذرے کو دیوتا تو نہیں کہہ سکتے لیکن اس کے ہر ذرے سے ان کے والہانہ عشق کا پتہ چلتا ہے۔
.....ہمارے ہندوستان کے پھول تو بیلا۔ چمیلی، جوہی۔ کیکتی کیسر۔ مالتی۔ مدن مست۔
لاجونتی کنول اور کسم ہیں۔ انہیں سے ہمارے دیس کی زمین اور جن سے ہمارے گیت صدیوں
سے مہکتے آئے ہیں۔ ہماری ہواؤں میں تو........ندیا کنارے بیلا کسی نے بویا کی مدھر تانیں
ہمیشہ سے گونجتی رہی ہیں اور آج بھی گونجتی ہیں۔''

اس خط میں ہندوستان کے مشترکہ کلچر کے گن گاتے ہوئے لکھتے ہیں

---

[۱] خاموش آوازیں ص ۴۸۔۴۹ جاں نثار اختر مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی بھوپال ۱۹۸۱ء

''ہمارا ہندوستانی کلچر اگر مختلف تہذیبوں او تمدنوں کے ملاپ سے بنا ہے لیکن اس کی اپنی ایک انفرایت ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کلچر کا حسین ترین عنصر عورت کا تصور ہے۔ ہندوستانی عورت جو سیتا۔ پاروتی۔ رادھا۔ ساوتری اور درمنتی کے روپ میں ہمارے سامنے آئی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ہمارے قدیم ہندوستانی کلچر میں عورت کے بارے میں جو نظریے ہیں ان بعض سقم اور خامیاں بھی ہیں۔ جنھیں آج قبول نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جہاں ہمارے کلچر کی اور دھارائیں نکھرتی ہیں اور ابھرتی ہیں وہاں عورت کے تصور کو بھی ابھرنا اور نکھرنا لازمی تھا۔ اور آج یہ تصور ابھرا ہے اور نکھرا بھی ہے۔''

اور آگے اس خط میں گیتا مقدس کی یوں اہمیت جتاتے ہیں۔ جاں نثار اختر کے یہ سارے افعال وعقائد ان کی حب الوطنی اور اخوت باہمی کے اس پیغام کی عکاسی کرتے ہیں جو سری کرشن جی نے گیتا میں वसुन्धरा कुटुम्बकम् کہہ کر دیے تھے۔

ملاخطہ ہو۔

''بتاؤ خدیجہ تم نے گیتا پڑھی ہے یا نہیں۔ اگر نہیں پڑھی تو تم ہندوستان کی کیسی بیٹی ہو۔ یہ تو ہمارے ہندوستان کا قرآن ہے گیتا کی عظمت سے کوئی انکار کر سکتا ہے انسان کی عظمت اور بے غرض عمل گیتا کی تعلیم کے اہم ترین عناصر ہیں۔ گیتا میں ذات پات کی بندشوں کے خلاف آواز ہے اور اسی اعتبار سے اس نے ویدوں سے انحراف کیا ہے۔ اور گیتا ہی کے الفاظ میں ''بے وقوف لوگ ویدوں کی الفاظ کی تعریف میں بڑھا چڑھا کر باتیں کرتے ہیں۔ اور یہ کہتے ہیں کہ ''اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے'' گیتا نے گیان اور دھیان کو ثانوی حیثیت دی ہے اور عمل یا کرم کو اولین یا بنیاد دی اس نے دینوی عمل کی اہمیت بھی الگ کر کے جتاتی ہے۔ چنانچہ اس

کے تیسرے باب میں جو فلسفہ عمل کے بارے میں ہے یہ اشلوک موجود ہے۔

''دینوی مفاد کے پیش نظر بھی تجھ پر عمل کرنا واجب ہے''

مجھے ایک امریکن مدبر Broks کے الفاظ یاد آرہے ہیں

ملاحظ ہو۔

Gate is India Contribution to the future religion of the world

''یعنی مستقبل میں جب دینا اپنے لیے ایک مذہب کی تعمیر کرے

گی (اور ظاہر ہے کہ وہ مذہب انسانیت کا مذہب ہوگا۔اختر) تو بھگوت

گیتا کی تعلیم کے عناصر اس میں شامل ہوں گے۔'' [1]

اس میں شک نہیں ہے کہ گیتا کی اہمیت شروع سے مسلم اردو کا زوال ہے۔سکندر نے یونان سے ہندوستان پر حملہ آور ہونے کے لیے روانہ ہونے سے پہلے اپنے استاد ارسطو سے پوچھا تھا تم ہندوستان سے کیا لائے ہو۔ارسطو کا جواب تھا گیتا۔اکبر نے فیض سے اس کا ترجمہ فارسی میں کروایا تھا۔نغمۂ الوہیت کے نام سے حسن الدین احمد نے اس کا ترجمہ اردو میں کیا تھا ہفت رنگ کے نام سے جعفر علی خاں آثر نے اس کا منظوم ترجمہ کیا۔غرضکہ گیتا کی اہمیت انسانیت کو انسان بنانے کے معاملے اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔جس کا ذکر جاں نثار اختر نے اپنی صاف سادہ زبان میں کیا ہے۔

جاں نثار اختر کی نثری صلاحیتوں سے صرف نظر ممکن نہیں۔یہ ہمارے مطالعہ کی کمی کہی جا سکتی ہے جو خاطر خواہ توجہ قارئین کی اختر کی نثر نگاری کی طرف نہیں ہوسکی اس کی وجہ میری سمجھ

---

[1] خاموش آوازص ۵۸-۵۹-۶۰ جاں نثار اختر مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی بھوپال ۱۹۸۱ء

میں یہ آتی ہے کہ اختر اوائل عمری سے ہی شعر وسخن کی طرف راغب تھے اپنی ولولہ انگیز انقلابی نظموں رومان پرور شاعری اور فلمی گیتوں کی مقبولیت اور شہرت نے بحیثیت ایک شاعر کے ان کی ساکھ قایم کردی ہے شاعری کی اس چمک دمک میں ہماری نظر ان کی نثری صلاحیتوں کی طرف کماحقہٗ نہیں اٹھ سکی اس کے شاعری کے بڑھے ذوق اور ضروریات زندگی کی تکمیل کے لیے انھوں نے فلمی گیتوں کے لکھنے کا سلسلہ تا حیات قایم رکھا۔ فلمی دنیا کی حد سے متزول معروفیتوں نے انھیں نثر کی طرف زیادہ متوجہ ہونے کی مہلت حالات نے ان سے چھین لی تھی۔ حالانکہ اختر میں تنقیدی بصیرت اور ادب کے صحتمندانہ پرکھ کا خاصا شعور تھا۔ انھوں نے اپنی طالب علمی کے دور میں علیگڈھ یونیورسٹی کی طالب علموں کی میگزین کی ادارات سنبھالی تھی اور ان کے ادارت یا قیام علیگڈھ میں میگزین کے وہ ستارے شایع ہوئے تھے جن میں نقد ونظر کے عنوان سے انھوں نے اپنے اداریوں کے علاوہ چند ادبی کتابوں پر تبصرے بھی لکھے تھے۔ ان کے یہ تنقیدی مضامین ان کی تنقیدی بصیرت پر دلالت کرتے ہیں۔

جاں نثار کا نثری کاوشات کا سرمایہ قلیل ہے۔ پھر بھی یہ اپنی قامت کے اعتبار سے کمتر ہوتے ہوئے بھی قیمت میں بہتر ضرور ہے۔ اختر نے اپنی یاداشت پر مشتمل ''ہزار باتیں'' کے عنوان سے مستقل کالم بھی اردو کے مشہور ہفت روزہ بلٹز میں مستقل طور سے کالم بھی لکھے ہیں۔ ان کی ان ہزار باتوں میں ادبی لطایف شخصی مرقع۔ ظریفانہ چٹکلے اور اپنی زندگی کے اہم اور دلچسپ واقعات کا ذکر انھوں نے کیا ہے۔ اختر کے سبھی نثری مضامین ادریے۔ تبصرے۔ دیباچے وغیرہ زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکے ہیں۔ صرف رسایل اور جرائد کے بطون میں یہ لائق قدر سرمایہ بکھرا اور چھپا ہوا ہے۔ ورنہ اردو کے نثری ادب کے سرمایہ میں ایک قیمتی اضافہ

ہوتا۔ ہزار باتیں کی شوخیٔ تحریر نے یقیناً بہت سے ان کے رازہائے سربستہ کو سامنے کر دیا ہے جو شاہد ان کی جنبش قلم کے بغیر درون پردہ ہی رہے۔ ذیل میں ان نثر پاروں کی وہ فہرست ہے جو جاں نثار اختر کی نثری کائنات اور ان کی ادبی اہمیت کا عکاس ہے۔

(ا) علیگڈھ میگزین کے دو اداریے (الف) میگزین بابت جنوری ۱۹۳۶ء جلد ۱۴ نمبر ۱

(ب) میگزین بابت اپریل ۱۹۳۶ء جلد ۱۴ نمبر ۲

مقالات اور دیباچے

(الف) مضطر ہندی شاعر کی حیثیت سے [۱]

(ب) عشق و محبت کے تصورات قدیم شاعری میں [۲]

(ت) مقالہ۔ کل ہند ترقی پسند کانفرنس [۳]

(د) اردو شاعری میں عورت کا تصور

(ر) علم و ادب کی نشو نما میں خیر آباد کا حصہ

(س) شاعری کا نیا موڑ [۴]

(ص) خیمۂ گل محمد علی تاج کے مجموعے کا دیباچہ [۵]

(ط) میرا دوست میرا مہمان مجاز کی موت پر تاثر [۶]

(ع) ساحر کا فلمی شاعری دیباچہ [۷]

(ف) ہزار باتیں [۸]

---

[۱] علیگڈھ میگزین جنوری ۱۹۳۶ء ص ۳۶۔۵۰
[۲] ماہنامہ افکار بھوپال اکتوبر ۱۹۴۷ء ص ۴۹۔۵۰
[۳] ماہنامہ افکار بھوپال خاص نمبر ۱۹۴۹ء ص ۷۸۔۷۹
[۴] ماہنامہ کردار بھوپال جنوری ۱۹۵۹ء
[۵] خیمۂ گل ص ۵۔۱۰
[۶] شاعر شہر نگاران مرتبہ سید محمد ہاسم مجاز ص ۳۱۔۳۹
[۷] ساحر اور اس کی شاعری پرکاش پنڈت ص ۱۱۴۔۱۲۴
[۸] ہزار باتیں ہفتہ روزہ بلٹز بمبئی ۳ر اکتوبر ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۱ء سے مختلف شمارے

یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر اچھا شاعر نثر نگار بھی ہو نظم اور نثر میں بیک وقت کمال کی مثالیں بہت ہی کم دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس لیے جاں نثار کو بھی شاعری میں جو مرتبہ حاصل ہوا وہ ایک نثر نگار کی حیثیت سے ان کو نہ مل سکا۔ اس کے باوجود ان کی شاعری کا جادو خلوص وعظمت اگر ایک سمت ان کی وقار عطا کرتی ہے تو ساتھ ہی ان کی نثر کی سلاست وروانی۔ نقد ونظر میں نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی ایسی صفات ہیں جو دیدہ دل کو متوجہ کرتی ہیں۔ اس میں کلام نہیں ہے کہ سنجیدہ نثر میں لکھنا ایک مشکل کام ہے اور بالخصوص ایسے شاعر کے لیے جو اپنے شاعرانہ ذوق ووجدان کی گہرائیوں میں مست وسرشار اور تخیل کی وسعتوں میں کھویا رہتا ہو۔ ایسے وہی شاعر کی نثر کی تنگنائے میں اپنی پرواز تخیل کے لیے وہ فضا میسر نہیں ہوتی جو اس کا ذوق چاہتا ہے یقیناً نثر کا میدان تنگ اور سمٹا ہوا ہوتا ہے جبکہ شاعری کی اقلیم کی سرحدیں متعین نہیں ہیں۔ جاں نثار کا سلجھا ہوا مزاج امن پسند افتاد طبع۔ صداقت اظہار اور فکر وفن کا خلوص ایسے اوصاف ہیں جنھوں نے ان کو پرکشش اور باوقار نثر لکھنے کا ہنر عطا کیا ہے۔ اختر کی شاعری میں جوش وخروش حد سے متجاوز نظر نہیں آتا یہی حال ان کی نثر میں دیکھنے کو ملتا ہے ان کا لہجہ ہمیشہ نرم اور سبک رہتا ہے انداز میں لطافت اور اسلوب میں سلاست وحلاوت ہے اور ایک خاص قسم کی سنجیدگی بھی۔ وہ اپنے خیالات کی ترسیل میں ہر طرح کامیاب نظر آتے ہیں۔

علیگڈھ میں طالبعلمی کا زمانہ اختر کی نثر نگاری کے لیے ایک سازگار فضا ثابت ہوا۔ شاعری کے علاوہ نثری ادب پاروں کے مطالعہ کا بھی خاصا موقع فراہم ہوا۔ مختلف اساتذہ شعرو سخن کے علاوہ اردو کے مسلم الثبوت اور صاحب طرز ادیبوں کی نگارشات وہ بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ محمد حسین آزاد حالی شبلی۔ سرسید اور ڈپٹی نذیر احمد کی تحریروں کے مسلسل مطالعہ نے

جاں نثار کونثر کے آہنگ اور اس کی خوبیوں سے کما حقہ روشناس کرادیا تھا۔ اور ان کو بھی نثر نگاری کا شوق پیدا ہوا تھا۔ ان کی نثری کاوشوں کا اولین نقوش علیگڈھ میگزین کے اداریوں کی مشکل میں محفوظ ہیں۔ اور آج بھی یہ اداریہ تعلیم اداروں کے ترجمان بنکر طالب علموں کی ذہنی اور علمی کاوشوں کی ترتیب وتہذیب کی خدمت انجام دیتی ہیں ان کی صلاحتیں پروان چڑھیں۔ اپنے پہلے اداریہ (جنوری ۱۹۳۶ء) میں انھوں نے خاص کر ادارات کے تبدیلی پر روشنی ڈالی۔ یونیورسٹی کے شب روز کا ذکر کیا۔ طلباء اور معزز ہستیوں کے وفات پر اپنے رنج وغم کا اظہار کیا۔ اس ادارئے کی یہ چند سطریں ملاخط ہوں جن میں سماجی شعور کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔

> ''مشہور انگریزی شاعر ٹنی سن کا مقولہ ہے کہ کائنات کا ایک نظام کہیں دوسرے نظام نو کو ہمیشہ اس لیے جگہ دیتا ہے کہ ایک عمدہ اور کامیاب اسلوب زندگی بھی استاد زمانہ کے باعث عالم کو گمراہ کرسکتا ہے۔ میگزین کی روایت کی تبدیلی بھی قدرت کے اس اٹل قانون کی تخلیق کہی جاسکتی ہے۔ ہر سال اس تبدیلی کے ساتھ میگزین میں نئی زندگی کی نئی لہر دوڑتی نظر آتی ہے۔ مضمون نگاروں کا نیا اضافہ مضامین کی کثرت کا نیا انداز شعر رات کی نئی نوعیت تازہ بہ تازہ نو بہ نو'' [1]

اس اداریے کی سادہ اور سلیس زبان پورے سال علیگڈھ کی ادبی سرگرمیوں کے ذکر کے ساتھ میگزین میں شامل نئے قلمکاروں کی حوصلہ افزائی نہایت فراخ دل کے ساتھ کی گئی ہے۔ اس طرح دوسری میگزین کے اداریے میں میگزین کی اشاعت میں دیر ہونے کا یوں ذکر

---

[1] شذرات جاں نثار اختر علیگڈھ میگزین جنوری ۱۹۳۶ء جلد ۱۴ نمبر ۱

کرتے ہیں۔

''گذشتہ چند سال سے میگزین کی اشاعت کس وقت کی پابند نہیں رہی۔کبھی ماہانہ ہوجاتا ہے کبھی ششماہی اس بے اصولی نے انتظار کی لذت کو ایک روح فرما بے اطمینانی میں تبدیل کرر کھا ہے وقت کا کوئی نہ کوئی تعین ہونا ضروری ہے۔موجودہ حالات کا تقاضا ہے کہ میگزین کو سہ ماہی کر دیا جائے اس طرح آیندہ کے لیے اس شکایت کا سرماب ہو جائے گا اور مالی دشواری بھی مٹ جائے گی'' [1]

اداریوں کے علاوہ ان دونوں شماروں میں اختر نے چند دوسری ادبی تخلیقات پر نقد ونظر کے عنوان سے تبصرہ کیا ہے۔ان تخلیقات کے نام ہیں

۱۔	طلوع اسلام	نذیر بنارسی	علیگڈھ میگزین جنوری ۱۹۳۶ء
۲۔	ادب لطیف	چودھری برکت علی	علیگڈھ میگزین جنوری ۱۹۳۶ء
۳۔	خانم	مرزا عظیم بیگ چغتائی	علیگڈھ میگزین جنوری ۱۹۳۶ء
۴۔	تذکرہ حالی	مولانا اسماعیل میرٹھی	
۵۔	بیتا	مجنوں گورکھپوری	
۶۔	دو ڈرامے	مترجمہ سعادت حسن منٹو	

[1] شذرات جاں نثار اختر علیگڈھ میگزین جنوری ۱۹۳۶ء جلد ۱۴ نمبر ۲

ان کتابوں پر اختر کے تبصروں کے مطالعہ سے یہ بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ جاں نثار میں ایک ابھرتے ہوئے نقاد کی صلاحیتیں پوری طرح سے موجود ہیں۔ اپنے اس تنقیدی شعور کی تہذیب میں اگر وہ تھوڑا اور انہماک صرف کرتے تو بلاشبہ ایک لایق قدر نقاد بھی بن سکتے تھے۔ پھر بھی ان تجربات سے ایک نقاد کی بالغ النظری اور نکتہ سنجی کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ تبصروں میں اختر نے ان کے متعلقہ مصنفیں کی کاوشوں کی کھل کر تعریف کی اور ان کو ادبی خدمات کو سراہا ہے۔ یہ طرز نقد ایک سلیم الطبع قلم کار کا پتہ دیتا ہے جاں نثار کے ادبی مقالات میں مصظر ہندی شاعر کی حیثیت سے خصوصی حیثیت واہمیت کا حامل تبصرہ ہے۔ اس میں انھوں نے ہندی شاعری کو ابتدا وارتقاء اور ہندی کے بڑے بڑے شعرا کے ذکر کے ساتھ ہندی شاعری کیا ارتقاء میں مسلمان ہندی گو شعرا پر بھی بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس مقالے میں کالیداس۔ چندر بردائی۔ تلسی داس۔ میرا بائی کے علاوہ مسلمان شعرا جیسے ملک محمد جائسی۔ رحیم۔ ملا داؤد۔ مبارک علی بلگرامی۔ کبیر۔ امیر خسرو وغیرہ تک ہندی شاعری کے ارتقاء کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ہندی زبان کی نثری اور لطافت جذبات کی فراوانی اور تصوف کا رنگ غرضکہ سبھی اوصاف کا نہایت منصفانہ جائزہ لیا گیا ہے۔ اس مذکورہ پس منظر میں مضطر کی ہندی شاعری کی خصوصیات کی وضاحت کرتے ہوئے بطور نمونہ ان کے اشعار بھی پیش کیے ہیں۔ اور آخر میں مضطؔر کا ہندی شاعری میں مرتبہ ومقام متعین کیا گیا ہے۔ مضطرؔ کو ہندی شاعر کی حیثیت سے متعارف کراتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

''اس وقت مجھے مضطر کو بحیثیت ہندی شاعری پیش کرنا ہے اور
مجھے فخر ہے کہ آج ہندی شعرا کی فہرست میں ایک قابل قدر نام کا اضافہ

کر رہا ہوں۔'' [۱]

جاں نثار مضطر خیر آبادی کو امیر خسرو کے ہم پلہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں

''جہاں تک گیتوں کا تعلق ہے مضطر خسرو کے ہم پلہ ہیں وہی درد۔ وہی کیف۔ وہی سادگی۔ جو خسرو کے یہاں ہے مضطر کے یہاں بھی موجود ہے'' [۲]

اس کے علاوہ مجموعی طور پر وہ مضطر کی ہندی شاعری کے سلسلے میں اپنی رائے یوں ظاہر کرتے ہیں۔

''ماننا پڑتا ہے مضطر قابلیت خداداد تھی وہ جو چاہتے تھے خود کہتے تھے۔ لکھتے تھے........ پھر بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر کسی نے اس زمانے میں کامیابی کے ساتھ ہندی شاعری کی تو وہ مضطر ہی تھے۔'' [۳]

اس ساری تحریر میں بیٹے کی خشت سے اختر کی اپنے والد سے عقیدت و محبت بھی شامل رہی ہے انھوں نے سہواً دانستہ اس دور کے دوسرے ہندی شعرا کے کلام سے مضطر کے کلام کا موازنہ کر کے ان کے مقام کو تعین کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ اگر موازنہ بھی شامل ہوتا تو اس تبصرے کی اہمیت دوچند ہو جاتی۔ اسی طرح جب اپنے اداریے میں کسی موت پر اپنے رنج و ملال کا اظہار کرتے ہیں تو ان کے جملے ان کے دل کے درد کی شہادت پیش کرتے ہیں مثلاً

''جواں مرگی کو اگر دنیا کا سب سے اہم المناک سانحہ کہا جائے تو

۱۔ مضطر ہندی شاعر کی حیثیت سے مبصر جاں نثار اختر علیگڈھ میگزین جنوری ۱۹۳۶ء ص ۳۷

۲۔ مضطر ہندی شاعر کی حیثیت سے مبصر جاں نثار اختر علیگڈھ میگزین جنوری ۱۹۳۶ء ص ۴۰

۳۔ مضطر ہندی شاعر کی حیثیت سے مبصر جاں نثار اختر علیگڈھ میگزین جنوری ۱۹۳۶ء ص ۵۰

بے جا نہیں۔ امسال دونو جوان طالبعلموں کی موت نے حشر بر پا کر دیا۔ ماہ جولائی میں سلطان مسجدھو کی فرقابی کی جاں گذر حادثے نے اپنے تو اپنے غیروں کو بھی آٹھ آٹھ آنسو رلائے......ماہ ستمبر میں ایم آئی عابد معلم بے اے فائنل کی موت نے دل پر اور چھری چلا دی'' [۱]

اس طرح عزیز لکھنوی کے سانحہ ارتحال ۔ کی موت پر اشک افشانی کرتے ہوئے دوسری اکابرین ادب کی موت کا ذکر نہایت دکھ سے کرے ہیں۔

''ابھی ہمارے آنسو۔ ریاض۔ رواں۔ آغا حشر کے ماتم میں خشک بھی نہ ہونے پائے تھے کہ جناب عزیز لکھنوی کے سانحہ ارتحال نے قیامت ڈھادی۔ عزیز اپنے دور کے ساتذہ میں ایک بلند درجہ رکھتے تھے۔ آپ کی شاعری نے لکھنوی اسکول میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ ادب اردو کی جو اعلی اور قیمتی خدمات آپ کی قلم نے انجام دیں۔ اس کا احسان ملک کبھی نہیں فراموش کر سکتا۔ آپ کی شاعری زندہ رہے گی۔ پھر بھی اس موت نے جو نقصان اردو زبان کی پہونچا اس کی تلافی کس طرح ممکن نہیں ہے

فروغ شمع جواب رہے گا صبح محشر تک
مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے [۲]

---

[۱] اداریہ جاں نثار اختر

[۲] علیگڈھ میگزین جنوری ۱۹۳۶ء شذرات

جاں نثار کا ایک مضمون ''عشق و محبت کے تصورات قدیم اردو شاعری میں'' ماہ نامہ افکار بھوپال میں ۱۹۴۸ء میں شایع ہوا تھا۔ یہ مضمون اختر کی شخصیت اور ان کے نظریات کی گہری چھاپ لیے ہوئے ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے رومانی اور تاثراتی تنقید کے ذریعہ اپنے ادبی مسلک کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اس کے علاوہ وہ وجدانی اضطرابی اور جمالیاتی نیز دیگر کیفیات کو جو مقدسین کی عشقیہ شاعری میں داخل ہیں انھیں اپنے ادبی مزاج کے آئینہ میں دیکھا ہے۔ ایک ایسا شاعر جو صرف اپنی یادوں کی دنیا میں بسر کرتا ہے اور اپنے تخیل کے بنیادوں پر ایک جنت تعمیر کیے ہوئے ہے۔ جسکو حسن کی بوقلمونیاں سیکڑوں رنگوں میں نظر آتی ہیں۔ تاثراتی تنقید کا میدان بہت وسیع ہے ڈاکٹر سیدہ جعفر نے اپنے ایک مضمون میں ڈاکٹر اسپنگر کے حوالے سے لکھا ہے۔

> ''کسی حسن پارے کو دیکھ کر جو جذبات واحساسات نقاد پر طاری ہوں ان کا ہو بہو بیان کر دینا تاثراتی دبستان سے تعلق رکھنے والے نقاد کے نزدیک تنقید نگاری کا سب سے بڑا مقصد ہے'' [۱]

حقیقت یہ ہے کہ اسپنگر نے داخل۔ جذباتی اور تاثراتی حقایق کے اظہار کو ہی تنقید کا معیار ٹھرایا ہے حالانکہ اس طرح کی تنقید کی خامی یہ ہے کہ اس کے ذریعے کسی ادبی کارنامے کو صرف شخصی معیاروں اور جذبات کے سہارے جانچا جاتا ہے اور اس طرح عقیلت افادیت اور ادب کی سماجی حیثیت ظاہر نہیں ہو پاتی۔ دراصل کسی شعری تخلیق پر بے لاگ اور غیر جانبدارانہ تنقید کرنا شاعر کے لیے ایک دشوار گزاواری کا سفر ہے۔ جانبداری سے ہر طرح اپنا دامن

---

[۱] شاہکار فراق نمبر ص ۲۳۴۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر

بجائے رکھنے کی کوشش کے باوجود بھی اس کا دامن آلودہ ہو ہی جاتا ہے۔ ایسی تنقیدوں میں یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ فن کی پرکھ کے جو معیار مقرر کیے گئے یا سانچے وضع کیے گئے ہیں وہ عام طور سے ایسے ہیں جن پر خود اس کی شاعری کھری نہیں اترتی۔ اپنے اس مضمون میں جاں نثار نے امیر خسروؔ اور سلطان قلی قطب شاہ کے زمانے سے لے کر داغؔ اور حالیؔ کے عہد تک کی شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ اس طویل مدتی سفر میں عشقیہ تصورات کو ان گنت اتار چڑھاؤ کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔ اختر نے اپنے مضمون میں ان تمام حقایق کا باریک بینی اور رقیہ رسی سے جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے ترقی پسند نقادوں کی طرح عشقیہ تصورات میں حقیقت اور واقعیت کا پورا لحاظ رکھا ہے۔ حالانکہ موضوع کی وسعت دامانی دیکھتے ہوئے یہ مضمون مختصر ہے لیکن ایک مخلصانہ کوشش ہے۔ اور تنوع کے اعتبار سے شاعری کے تمام موضوعات پر محیط ہے دراصل یہ مضمون ایک سنجیدہ شاعر کے اس ذہن کی پیداوار ہے جس ادب معاشرے اور زندگی کے بہت سے مسائل یک جانظر آتے ہیں۔ رقیہ رسی اور باریک بینی سے زندگی کے مسائل نہایت استدلال سے غور فکر کر کے اس کے دل کی تلاش جاں نثار کے نزدیک ہی تنقید کا منصب ہے۔ ایک نہایت کامیاب مضمون نگار کی طرح جاں نثار نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور اس کے تمام پہلوؤں پر غور وفکر کی ہے۔ اس طرح انھوں نے ایک کامیاب نقاد کے فرائض پوری طرح انجام دیئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کی ان کا مضمون پڑھ کر کسی طرح کی تشنگی یا کمی کا احساس نہیں رہ جاتا۔ جاں نثار نے اردو کی قدیم عشقیہ شاعری کے رنگا رنگ موضوعات کا یوں ذکر کیا ہے۔

''اردو کی عشقیہ شاعری کا ایک لمحہ کے لیے تصور کیجئے تو محبت کی کتنی جگ بیتیاں اور کتنی آپ بیتاں سنائی دینے لگتی ہیں عشق و محبت کے کتنے

تصورات اور کتنی تاریلیں ذہن میں ابھرنے لگتی ہیں محبت کے مختلف نظریے مختلف پہلو مختلف مدارج اور اس سے وابستہ حزن ونشاط کی صدہا کیفیات صدہا ہلکے گہرے رنگ کتنے اندھیرے اور اجالے دھوپ چھاؤں بنکر۔ دل و دماغ پر چھانے لگتے ہیں ہمیں اپنی عشقیہ شاعری کی دنیا میں کیا نہیں ملتا یہاں خدا کی محبت بھی ہے اور بتوں کی پرستش بھی۔ یہاں روحانی اور سرحدی عین Ideal کی طلب بھی ہے اور جسمانی حسن کی کشش بھی۔ مرد کی عورت سے عورت کی مرد سے جنسی محبت بھی اور ہم جنسانہ لگاؤ بھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے مصحفی نے یہ شعر ہمارے اردو شعرا کے لیے کہا تھا'' [۱]

صفحہ روزگار پر لکھ لکھ کر
عشق کی داستان چھوڑ گئے

اس اقتباس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ جاں نثار نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ توضیح اور تفہیم میں لطافت اور بوقلمونی کے معیار کو پیش نظر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اردو شاعری کے مختلف موضوعات پر نظر ڈالی ہے۔ جو ان کے مطالعہ کی وسعت کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ اختر جذبہ عشق میں صداقت کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ وہ شاعری کو زندگی

---

۱ افکار بھوپال ص۴۴ ۱۹۳۶/اپریل شمارہ ۱۴/نمبر ۲

کے آئینہ میں پرکھنے اور دیکھنے کے خوگر ہیں اس لیے وہ عشق کے متعلق وہ انھیں احساسات اور جذبات کے ذکر شاعر کے لیے مناسب سمجھتے ہیں جن کا واسطہ انسان کو اپنی زندگی پر پڑتا ہے ہندی شاعری سے متاثر ہیں۔لیکن صوفیانہ طرز شاعری کے بجائے مجازی شاعری پر زور دیتے ہیں۔اس مضمون کے چند اقتباصات ملاخطہ ہوں۔

(۱) ''افضل عشق کا صحت مند تصور رکھتا ہے۔ وہ اپنی محبت میں کامیاب ہے لیکن قزلباس کو باسن کی بیٹی کی گالیان بھی کھانے کو ملتی ہیں'' [۱]

(۲) میر کے یہاں حرمان عشق کا تصور فرمان عشق کے تجربے پر مبنی ہے.....سودا اور اس کے دور کے تمام شعرا کے عشق کا تصور عموماً مجازی ہے....مظہر جاں جاناں اور میر درد کی عملی زندگی صوفیانہ اور درویشانہ تھی جس کا اثر ایک حد تک ان کی شاعری پر بھی پڑا''

(۳) نظیر کی شاعری کا دور بھی یہی ہے لیکن وہ اپنی منفرد حیثیت رکھتا ہے۔اس کے یہاں وہ دنیا نظر آتی ہے جو بہت کشادہ اور وسیع ہے۔نظیر کا عشق نشاطیہ تصور رکھتا ہے۔''

(۴) لکھنؤ کے اسی دور کے مقابلے میں دہلی کی شاعری میں اس دور کی فضا کا احساس ہوتا ہے۔دہلی کے شعرا کے یہاں ہار جیت کے بجائے داخلی جذبات و کیفیات کی ترجمانی ملتی ہے''

---

[۱] ماخوز اختباسات از افکار بھوپال ص ۴۴-۴۵

اقتباسات مندرجہ کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ اختر نے اپنے موضوع سے متعلق معلومات حاصل کرنے میں کسی قدر کدوکاوش اور محنت اور بلیغ نظری سے تہہ تک پہونچنے کی کوشش کی ہے۔ نیز یہ کہ اختر نے اپنے نظریات کو اختصار اور جامعیت کے ساتھ واضع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اختر نے شاعر کے کلام کی جانب جو بلیغ اشارات زبان و بیان کے لطف کے ساتھ پیش کیے ہیں وہ خاصے دلپزیر ہیں اور یہ عکس اختر کے دوسرے نثر پاروں میں ہویدہ ہے۔ اس مضمون سے قدیم اردو شاعری کے موضوعات اور ان موضوعات میں وقتاً فوقتاً ہونیوالی تبدیلیوں کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے۔ مضمون میں اختر نے جن شعرا کے متعلق اپنے قلم کو حرکت دی ہے اس مضمون سے اپنے اختصار کے باوجود متعلق شاعر کے رجحان کا ضرور پتہ چلتا ہے۔ مجازی عشق کے قائل ہونے کے باوصت اختر کسی قسم کے متذل اور عاسیانہ تصور عشق کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ کی رنگینیوں میں ڈوبی ہوئی شاعری کے مقابلے میں وہ دہلی کی شاعری کو ترجیح دیتے اور لکھنؤی شعرا کے مقابلے میں دہلوی شعراء کی تعریف کرتے ہیں......ظاہری شان وشکوہ اور تصنع یا ریا کے برعکس سادگی صدق دلی اور خلوص کے وہ قدر شناس ہیں بلند عشقیہ تصورات و خیالات کے ترجمانی ہی ان کے نزدیک اچھی شاعری ہے۔ انھیں غالب کا یہ انداز پسند ہے ؎

چاہتے ہو خوبرویوں کا اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

عشق کے معاملے میں اختر غالب کی شاعری کے معتقد و مداح ان کا اعتراف ہے۔

> ''ہمارے تقریباً تمام شعرا میں محبت کا شعور محدود ہے۔ لیکن غالب کے یہاں عشق و محبت کا شعور ہمہ گیر ہے اس میں وسعت بھی ہے تنوع بھی ان کی عشقیہ شاعری میں تجربہ بھی ملتا ہے اور تجزیہ بھی ۔ ان کے یہاں جذبہ بھی ہے ذہن بھی ، دل کی سادگی بھی ہے ۔ عقل کی پرکاری بھی ، غالب نے عشق کا گرم و سرد دیکھا ہے۔ عشق کے ان تصورات نے غالب کی عشقیہ شاعری کو بڑی بنا دیا ہے'' [۱]

اختر کی تبصرہ نگاری یا تنقیدی رویے کو پوری طرح سمجھنے کے لیے میرے نزدیک ان کا نمونۂ تنقید درج کر دینا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے نذیر نیازی کے طلوع اسلام کے پہلے شمارے کے بارے میں علیگڈھ میگزین کی جنوری ۱۹۳۶ء کی اشاعت میں لکھتے ہوئے اس کے اجرا کے مقصد کو بھی واضع کرتے ہیں۔ اس میگزین میں اختر کے تین تنقیدی راویے ملاخطہ کیجئے۔

> (۱) ''اس رسالے کا مقصد ملت اسلامیہ کو دور حاضر کی روشنی میں دیکھنا ہے۔ فہرست مضامین میں مشہور مضمون نگار آئے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مولانا اسلم جیراجپوری وغیرہ۔ صاحب مجلّہ نے اس نمبر کو شرف کے ممتاز ترین شاعر علامہ اقبال کے نام سے منسوب کیا ہے۔ شروع میں علامہ موصوف کی ایک بے بہا نظم مدنیت اسلام کے

---

[۱] افکار خاص نمبر بھوپال ۱۹۴۹ء ص ۹۷

عنوان سے نصب رسالہ ہے'' ختم مذمت کے عنوان سے مولانا اسلم جیرا جپوری نے ایک مفید اور عالمیانہ مضمون سپرد قلم کیا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے اپنے مضمون۔ سیاست معاش'' میں نظام معیشیت کے رقیق مسائل کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے یقین کا اظہار کیا ہے کہ اگر مسلمان اپنے دین کی سچی معاشی تعلیم پر عمل پیرا ہوں تو نہ صرف وہ اپنی جماعت کو ہی منفعت پہونچا سکتے ہیں بلکہ اپنے ملک کی بھی ایک عظیم الشان خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ ہندوستان کے موجودہ مسایل میں ''طلوع اسلام'' کو ایک ممتاز جگہ دی جاسکتی ہے۔ ہم اس کا پرزور خیر مقدم کرتے ہیں'' [۱]

(۲) ادب لطیف کے ایک شمارے پر جاں نثار کا تبصرہ ملاحظہ ہو۔

''ادب لطیف دنیائے ادب میں اس سال کی پیداوار ہے۔ اس وقت جو نمبر ہمارے پیش نظر ہے ان میں جناب ل احمد اکبرآبادی۔ اختر شیرانی۔ اور علیم سالک کے نام خاصی طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس رسالے میں مختصر افسانے اور انشایئے لطیف کے نمونے نظر آتے ہیں........ جناب حفیظ جالندھری نے میر کی طرح اور انھیں کے رنگ میں ایک غزل کہی ہے۔ جو رسالے میں موجود ہے....... جناب حفیظ کی غزل کامیاب نہیں کہی جاسکتی آخری شعر میں پنجاب کو اردو زبان کا مرکز قرار دیا ہوتا مگر جنگ کے خیال مالغ آیا۔

---

[۱] علیگڈھ میگزین جنوری ۱۹۳۶ء ص ۱۴۸-۱۴۹

جنگ چھڑ جائے جو ہم کہہ دیں
یہ ہماری زبان ہے پیارے

''پسند عام کی خاطر اردو رسالے اب بازاری تصویروں سے پُر نظر آتے ہیں یہ طریقہ ہمارے نزدیک ایک مذموم سی رسم ہے۔ اس کے متعلق صرف یہ عرض کرنا ہے کہ تصاویر کے انتخاب میں مذاق صحیح سے کام لیں'' [۱]

عظیم بیگ چغتائی مشہور طنز مزاح نگار ہیں۔ ان کے مجموعہ مضامین ''خانم'' پر بھی اپنی بے لاگ رائے ظاہر کی ہے اس میگزین کے اپریل کے شمارے میں جاں نثار نے تذکرہ حالی مصنفہ مولانا محمد اسماعیل میرٹھی پر بے لاگ تبصرہ کرتے ہوئے اپنی رائے یوں ظاہر کیا ہے۔

'' تذکرۂ حالی مولانہ کی میسوط سوانغ عمری نہیں کہی جاسکتی پھر بھی اس وقت کے تمام شایع شدہ تزکروں میں اس کو ایک امتیاز اور فوقیت حاصل ہے۔ حالات اور واقعات کے مختصراً اسکو جامع طور پر بیان کیا گیا ہے۔'' [۲]

اسی طرح مجنون گورکھپوری نے ہارڈی کے ناول سے متاثر ہو کر ایک افسانہ بیتا لکھا تھا اس پر رائے زنی کرتے ہوئے اختر نے محسوس کیا ہے اس افسانے میں مجنوں کے ذاتی تجربات اور مشاہدات کا بھی کافی دخل ہے مجنوں نے اکثر افسانوں میں غیر ملکی ادب سے کافی فائدہ اٹھایا

....

[۱] [۲] علیگڈھ میگزین جنوری ۱۹۳۶ء ص ۱۴۸۔۱۴۹ اور ۱۶۶۔۱۶۷

ہے۔ چیخوف کے دوڈراموں کے سعادت حسن منٹو کے ترجمہ کے بارے میں اختر کی رائے ہے کہ چیخوف کے ڈرامے روس کی روزمرہ کی زندگی کی تصویر پیش کرتے ہیں ان ڈراموں کا کمال یہ ہے کہ یہ فطرت انسانی کی ترجمانی ہیں۔ سعادت نے نہایت فراخ دلی سے چیخوف کے فن کمال کو برقرار رکھتے ہوئے ترجمہ کیا ہے یہی اچھے ترجمان کی پہچان ہے۔ ان تبصروں کے علاوہ بھی جاں نثار نے بھوپال کے مشہور شاعر محمد علی تآج کے مجموعہ کلام خیمہ گل پر ایک گراں قدر دیباچہ لکھا ہے اس دیباچے میں تاج کے شاعرانہ عظمتوں کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''تاج کی غزل نئی غزل کو پوری انفرادیت کرتی ہے۔ تاج آج کی نسل کے ان چند شعرا میں ہیں جنکی کاوشیں آج غزل کو اور زیادہ دلکش تابناک اور حیات افروز بنانے میں صرف ہورہی ہیں۔'' تاج کی غزلوں میں موجودہ طبقاتی نظام سے بے زادی ہے نسل و رنگ کے امتیاز کے خلاف احتجاج ہے انسانی جدوجہد پر عمل اعتماد ہے وہ نئی طلوع سحر پر یقین رکھتا ہے وہ انسانی درجہ کو صرف محسوس نہیں کرتا بلکہ اس کے درمیان سے بھی واقف ہے ۔

درد اس دور کی تقدیر ہے لیکن اے دل
صرف اک معرکۂ محنت وزر ہونے تک [۱]

خیمہ گل کے دیباچے کے ان اقتباسات سے جاں نثار اختر کے صاف ادبی ستھرے

---

[۱] علیگڈھ میگزین بابت اپریل ۱۹۳۶ء ص ۱۶۶۔۱۶۷

ذوق اور ادبی پرکھ کے معیار کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے انھوں نے تاثراتی نقادوں کی طرح محض تاثرات ہی نہیں پیش کیے ہیں بلکہ ان کے کلام سے مثالیں پیش کر کے شعری انفرادیت کے نقوش ابھارے ہیں جاں نثار کی یہی ادبی پرکھ انھیں تاثراتی نقادوں سے الگ مقام عطا کرتی ہے۔ ساحر لدھیانوی کے فلمی گیتوں کا مجموعہ '' گاتا جاوے بنجارہ'' کے عنوان سے پرکاش پنڈت نے مرتب کیا تھا۔ جاں نثار نے اس کے دیباچے میں (جو ایک طویل مقالہ کہا جاسکتا ہے) فلمی نغمہ نگاروں کے تکنیک۔ فنی تقاضوں اور ادبی معیار اور فلمی گیتوں کو مقبولیت عطا کرنے میں ترقی پسند شعرا کی خدمات پر ایک مفصل خیال ظاہر کیا ہے۔ انھوں نے ساحر سے پہلے کے شعرا کا بھی ذکر کیا ہے۔ جو ماضی میں فلمی دنیا سے وابستہ رہ چکے تھے، جاں نثار کا یہ تجزیہ تھا کہ ساحر نے پہلے پہل فلمی گیتوں میں ادبیت شامل کر کے ایک نئی روایت کو جنم دیا ہے اور ساحر کے بارے میں لکھتے ہیں۔

'' ساحر ایک باشعور شاعر ہے اور اس کے گیتوں میں بھی جو غم جاناں پر مشتمل ہے ہمیں غم دوراں کی جھلکیاں بھی مل جاتی ہیں '' [۱]

'' یہ حقیقت بھی کہ ساحر کے گیتوں میں سب سے نمایاں خصوصیت ان کا ترقی پسندانہ مواد ہے۔ اس نے واقعی بڑی جرأت اور قیمت کے ساتھ اپنے گیتوں کو یہ آواز دی ہے۔ شاعر کے سلسلے میں '' گاتا جائے بنجارا '' میں مزید لکھتے ہیں '' ساحر کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے فلموں کو ایسے گیت دئے جو سیاسی اور سماجی شعور سے لبریز ہیں یہ ایک بڑا اقدم

---

[۱] گاتا جائے بنجارہ ص ۹۔۱۰

ہے۔ جو ساحر نے بڑی دلیری کے ساتھ اٹھایا اس نے نہ تو خود کو دھوکا
دیا اور نہ اپنے فن کو۔ ترقی تحریک کو اور نہ عوام کو اس نے وہ کام کیا جو
ایک بیدار شاعر کا فرض ہوتا ہے۔'' [۱]

ان اقتباسات سے یہ اندازہ لگانا نہیں ہے کہ جاں نثار نہ صرف یہ کہ ایک کامیاب اور بالغ النظر مبصر تھے بلکہ ایک منفرد دیباچہ نگار بھی تھے۔

میرا دوست میرا مہمان :۔

مجاز کی موت سے متاثر ہو کر جاں نثار کا یہ ایک بیانیہ قسم کا مضمون ہے۔ ۱۹۴۶ء میں اختر جب وکٹوریہ کالج بھوپال میں لکچرار تھے اس زمانے میں کالج کے سالانہ مشاعروں میں آئے ہوئے مجاز جاں نثار کے یہاں ٹھہرے تھے۔ اختر مجاز کے دو چار دن ان کے گھر قیام کی وجہ سے بے حد خوش ہوئے تھے اس کا مفصل ذکر اسی مضمون میں انھوں نے کیا ہے۔ مضمون سے اختر اور مجاز کے آپس خلوص کے ساتھ صفیہ اور مجاز کی بے پناہ محبت کا پتہ چلتا ہے اس ملاقات میں مجاز کے مزاج کی بدلہ سنجی اور برجستگی کے واقعات بھی سامنے آئے جن کو جاں نثار نے ''ہزاروں باتیں'' میں درج کیا ہے اس کے علاوہ مجاز نے ان کے بے حد لگاؤ کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اس مضمون کی زبان صاف سادہ اور رواں دواں ہے۔ مضمون افسانوی رنگ لیے ہوئے ہے۔ مجاز سے ملاقات کا ذکر پر اثر اور درد انگریز ہے۔ جو دلوں کو متاثر کرتا ہے۔ اختر نے مجاز کی بے روزگاری پر اپنی ملامت کا اظہار کیا ہے اور مجاز کی پوزیشن بھی واضع کی ہے۔

''بے روزگاری کے پیچھے اس کی ناکام معاش جدوجہد کی کتنی لمبی

---

[۱] گاتا جائے بنجارہ ص ۹۔۱۰

داستان چھپی ہے.........اس نے کبھی جھوٹی مفاہمت کی آڑ لے کر
اپنے ضمیر اور ترقی پسندی کو بیچنا گوارا نہ کیا'' [۱]

ہزاروں باتیں:۔

جاں نثار کی ماضی کی یادیں میں جو ہفتہ وار ربلٹز بمبئی وقتاً فوقتاً شایع ہوئی ہیں۔ جاں نثار نے اپنی قوت حافظہ جو بہت زیادہ قوی تھا کہ مدد سے مختصراً چند نا قابل فراموش واقعات دلچسپ لیکن اہم باتوں کا ذکر کیا ہے۔ اپنی قوت حافظہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''جہاں تک میرا تعلق ہے۔ مجھے بے تحاشا شعر یاد ہیں۔ غالباً
ابن شیق نے شاعر ہونے کے لیے ایک لاکھ شعر یاد ہونے کی قید لگائی
ہے۔ اگر وہ کچھ زیادہ قید لگاتا تو کم از کم مجھے فکر نہ ہوتی۔'' [۲]

ہزاروں باتوں میں کچھ شخص مرقع کچھ ظریفانہ چٹکلے کچھ سیاسی اور ادبی جلسوں اور شاعروں سے متعلق واقعات اور انکشافات ہیں علاوہ ازیں اپنی زندگی کے بھی اہم واقعات کا ذکر ہے۔ اصباب اور ادبی محافل میں جو اکثر ادبی چھیڑ چھاڑ ہوتی تھی اس کو بھی بڑے لطیف پیرایے میں بیان کیا ہے۔ ان صحبتوں اور تذکروں میں خاص طور سے آل احمد سرور۔ جوش۔ مجاز۔ سردار جعفری۔ فیض۔ جذبی اور فراق کے اذکار ہیں۔ جو اختر کے سامنے کے ہیں گویا یہ اختر کی آپ بیتی ہے۔ اس قسم کا اذکار اکثر قدیم اردو ادب کے تذکردوں اور تاریخوں میں بھی نظر آتا ہے۔ مثلاً آب حیات میں آزاد نے ایسے بعض دلچسپ واقعات کو شامل کیا ہے جو دلچسپ بھی ہیں اور ادبی حسن کے عکاس بھی..جدید شعرا کے متعلق ایسے پر لطف اور اہم

---

[۱] شاعر شہر نگاراں ص ۳۳ [۲] شاعر شہر نگاراں ص ۳۶۔۳۷

مشاہدات کا ذکر دستیاب نہیں سوائے ان کے جن کو کچھ عرصے قبل نریش کمار شاد نے ضبط تحریر کیا تھا۔ جو بیسویں صدی دہلی میں مسرخ ہے اور پھر شان نزدل کے عنوان شایع ہوا کیا لیکن شاد کی موت سے یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ اختر کی ہزاروں باتوں کی اہمیت اس لیے زیادہ ہے کہ یہ سنی سنائی باتیں نہیں ہیں بلکہ اختر کے مشاہدات پر مبنی ہیں گویا آپ بیتان ہیں اس لیے مستند بھی ہیں نیز یہ کی ان کی صداقت اس لیے بھی ہے کہ جس وقت ہزاروں باتیں لکھی گئیں ان میں قریب سبھی حضرات بقید حیات تھے اس تحریر کا مقصد بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ متعلق شاعروں اور ادیبوں کی زندگی کے جزئیات بھی پردہ خفا میں نہ رکھ کر ظاہر ہو جائیں۔ ہزاروں باتوں میں اختر کی زندگی کی بھی چند اہم جھلکیاں ہیں جیسے اس میں ۱۹۲۵ء میں اختر کے بچنے کا ایک واقعہ ہے اس میں انھوں نے اپنے والد مضطر خیرآبادی اور ریاض کی خیرآبادی کی ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے اس فن میں انھوں نے ریاض کی ایک غزل کا مقطع پیش کیا ہے۔

کل ہم گئے تھے دیکھ کے آنسو نکل پڑے
بے شمع و گل ریاض کی تربت چمن میں تھی

ریاض کی وفات ۱۹۳۴ء میں ہوئی تھی چار سال بعد ۱۹۳۸ء میں جب اختر نے ان کی قبر کو دکھا تو بے ساختہ یہ قطع ان کی زبان پر آ گیا تھا۔ یہ اختر کے حساس دل کی آواز کہی جاسکتی ہے حالانکہ شعر ریاض کا ہے۔ ہزاروں باتوں میں ریاض کی عسرت ان کے ناول حرم سرا کے یادگار حسین میں نشتر کا ریاض سے اصلاح لینے کا حال بھی درج ہے۔ ۱۹۳۴ء کی ایک بات میں

علیگڈھ کے ایک مشاعرے میں مولانا حسرت موہانی کا ذکر کیا ہے اختر کی نظم دیکھ چمکا ستارہ مسحری پر مولانا نے یہ رائے دی تھی۔ ''بہت اچھی تشبیہیں دی ہیں جانتے ہو سب سے اچھی کون سی تشبیہ تھی۔

''جیسے جگنو سیاہ آنچل میں'' ۱

اور مونالاحسرت کی شخصیت کے بارے میں اختر کی یہ رائے تھی

''مولانا حسرت کی شخصیت نہ جانے کتنے رنگوں سے مل کر بنی تھی۔ ان کی شخصیت میں سیاست مذہب تصوف عشق پروری اور حسن پرستی سبھی رنگ قوس وقزح کی طرح گھلے ملے تھے۔ پھر ان کی شاعرانہ عظمت کی راز ان کے مزاج اور افتارطبع کا ممنون ہے۔ جس میں عشق کا ضمیر اور حسن پرستی کا شعور بدرجہ اتم موجود تھا ان کے نزدیک ہمارے اخلاق ہماری معاشرت اور ہماری تہذیب کو بلند کرنے میں حسن پرستی کا بڑا حصہ ہے'' ۲

جیسا کی عرض کیا جاچکا ہے۔ ہزاروں باتوں میں مجآز کی حاضر جوابی اور بذلہ سنجی کے کچھ واقعات کا بھی ذکر ہے ان میں سے چند ملاخط کے لیے پیش ہیں۔

''ایک مرتبہ کھانا کھانے کے بعد جوش Wash Basin میں

---

۱ ہزاروں باتیں ہفت روزہ بلوز ممبئی ۶ر فروری ۱۹۷۱ء ص ۲۱

۲ ہزاروں باتیں ہفت روزہ بلوز ممبئی ۳۰ر جنوری ۱۹۷۱ء ص ۲۱

کلیوں پر کلیاں کر رہے تھے مجاز سے نہ رہا گیا بول اٹھے

''آپ کلیاں کرتے ہیں یا کلیات'' [1]

ایک مشاعرے میں غزل سرائی کے دوران نوح ناروی کے مصنوعی دانت نکل پڑے۔
انھوں نے بغیر دوبارہ دانت لگائے پوپلے منہ سے شعر سنا دیا۔ مجاز فوراً بول اٹھے

''واہ استاد کیا خالص زبان کا شعر عطا کیا ہے'' [2]

''مجاز نے مہاراجہ محمود آباد سے پانچ روپیہ ماہانہ وظیفہ اس شرط پر

کہ تم شراب چھوڑ دینا قبول نہ کیا اور نہایت معصومانہ انداز میں جواب

دیا ''تو پھر ہم ان پیسوں کا کیا کریں گے'' [3]

ایک مرتبہ ترقی پسند مصنفیں کی کانفرنس میں جب اختر جمال تقریر کر رہی تھیں اور انھوں
نے کہا

''اب وقت آگیا ہے جب اس انجمن میں صرف سرخ ادیب سرخ شاعر۔ سرخ
ڈرامائسٹ سرخ نقاد۔ سرخ ناول نگار اور سرخ افسانہ نگار ہیں رہ سکیں گے۔''

مجاز سے رہا نہ گیا فوراً اٹھے۔ ''میں محترم خاتون سے گذارش کروں گا کہ کم از کم گلابی
Sllow کریں'' [4]

اس طرح کے اور بھی بہت سے لطائف ہزاروں باتیں کے دامن میں ہیں ان میں کچھ
اور ملاحظہ ہوں۔

---

[1] ہزاروں باتیں ہفت روزہ بلوز ممبئی ۲۶ر ستمبر وا/ا اکتوبر ۱۹۷۰ء ص ۴

[2] ہزاروں باتیں ہفت روزہ بلوز ممبئی ۹ر جنوری ۱۹۷۱ء ص ۷

[3] ہزاروں باتیں بلوز ممبئی ۲۰ر جنوری ۱۹۷۱ء ص ۲۰ [4] ہزاروں باتیں ص ۲ ۱۲ر ستمبر ۱۹۷۱ء

بھوپال کے ایک مشاعرے میں محمد علی تاج نے فراق سے کہا'' کہ ان کو مرنے کے بعد جلایا نہ جائے بلکہ دفن کیا جائے تا کہ ان کا عرس منایا جائے'' فراق موڈ میں تھے کہنے لگے

''بھائی ہمیں منظور ہے ہم سے وصیت لکھوایا'' [۱]

جاں نثار نے ہزاروں باتیں میں فحش گوئی پر لکھتے ہوئے مختصراً لکھا ہے

'' دنیا کے ہر ادب میں جنسی میلانات کا عکس کسی نہ کسی شکل میں ضرور ملتا ہے۔ اس موضوع پہ جب کسی کا قلم اٹھتا ہے تو فحش گوئی کا الزام آ جاتا ہے۔ ..فارسی ادب میں عبید زاکانی کی ہزلیات ہر ہی موقوف نہیں مولانا روم کو مثنوی شیخ سعدی کی حکایات مولانا جامی کی مثنوی یوسف زلیخا میں کیا کچھ نہ ملے گا وہ فردوسی ہوں انوری ہوں۔یا خسرو سب کے یہاں اس نوع کے اشعار ملیں گے۔ اردو شاعری میں غزلوں میں سودا کی ہجویات مین مومن کی مثنویوں میں ایسے اشعار کی کمی نہیں ہے جن پر یہ الزام فحش گوئی عاید نہ ہو سکے۔لکھنؤ اسکول کی شاعری اس خصوص میں بدنام ہے'' [۲]

اس طرح کی اور بہت سی باتیں اور حقایق ہیں جن پر جاں نثار کی نگاہ تھی اور ان میں اکثر انھوں نے ہزاروں باتیں میں ان کو بھی لکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایسے لطیف اور عبرت انگیز واقعات ہیں جن پر نہیں کہتے بنتا ہے'' ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے'' لہرنوع ملاخطہ کیجئے۔

---

۱ ہزاروں باتیں بلوز ممبئی ص ۱۰ نمبر ۳ ۱۹ ستمبر ۱۹۷۰ء

۲ ہزاروں باتیں بلوز ممبئی ص ۱۶ نمبر ۵ ۱۹ ستمبر ۱۹۷۰ء

''اختر الایمان کے غلط نام پر مولانا آزاد کے اعتراض کے جواب
کے باوجود ساہتیہ اکیڈیمی نے ان کے مجموعہ کلام 'یادیں'' پر انعام دیا
جس میں ایک نظم میرا نام بھی شامل ہے اس نظم میں مولانا موصوف کے
اعتراض کی طرف اشارہ ہے اور وہ اکیڈیمی کے ممبر بھی ہیں۔'' [۱]

دوسری جنگ عظیم کے موقع پر فوجی بھرتی کی حمایت میں حفیظ جالندھری ایک گیت سنا رہے تھے۔ اس شعر پر

دینا دویں سے بیگانہ ہوجا
دیوانہ بن جا بن جا شرابی

کسی نے کہا ''واہ حفیظ صاحب کیا مینشن بلڈنگ پروگرام ہے'' [۲]

ایک اور عبرت آموز واقعہ ملاحظہ ہو جو ہزاروں باتیں کے دامن میں نظر آتا ہے حالانکہ ایسے اذکار کی تعداد زیادہ تاہم اس موقع پر یہ خاصے چیز محسوس ہوتی ہے واقعہ یہ ہے کہ

''اوپیندر ناتھ اشک کے انسانوں کا مجموعہ ''بیگن کا پودا'' پر محکمہ
زراعت یوپی نے ایک ہزار کاپیوں کا آرڈر دیا۔ یہ کتابیں ان کو فراہم
کردی گئیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ افسانوں کا مجموعہ ہے'' [۳]

ہزاروں باتیں مزاحیہ لطیفے علمی اور ادبی مباحث ترقی پسند رجحانات کی تبدیلیاں اور اس

---

[۱] ہزاروں باتیں بلٹز ممبئی ص۱۶ نمبر۵ ۱۹ ستمبر ۱۹۷۰ء

[۲] [۳] ہزاروں باتیں بلٹز ممبئی

زمانے کے اختر کا آنکھوں دیکھے حال کے علاوہ بہت سی مشہور ہستیوں جیسے ریاضؔ۔ حسرتؔ۔ جوشؔ۔ وسیمؔ اور فانیؔ وغیرہ کی شخصیت اور سیرت سے متعلق بہت سی نادر معلومات ہیں ان مضامین کے آئینے میں اختر کی زندگی اور شاعری کا بھی علم حاصل ہونے کے ساتھ ان کی شخصیت اور سیرت و کردار کے بہت سے پہلو سامنے آتے ہیں۔ ہزاروں باتیں کا یہ علمی کارنامہ اردو کے نثری ادب میں ایک خاصے کی اور الگ ہی نوعیت کی چیز ہے اس عظیم کارنامے سے اردو نثر میں آئندہ ایک نئی صنف کے ایجاد ہونے کے قوی امکانات ہیں۔ اردو نثر کے سلسلے میں اختر کے اداریے۔ دیباچے تبصرے اور کالم نویسی کی خوبیوں اور ان کی گونا گوں صفات سے صرف نظر ممکن نہیں ہے اس طرح ان کی وہ تقاریر جو انھوں نے وقتاً فوقتاً مختلف ادبی محفلوں اور کانفرنسوں میں زبان وادب کے مختلف پہلوؤں اور تقاضوں پر کی ہیں بہت اہمیت کے حامل ہیں یہ تقاریر یا تعارف ایک خاصے سرابوط اور مسلسل مضمون کا لطف دیتی ہیں یہ صحیح ہے کہ ادبی جلسوں کی مکمل روداد قلمبند کرنے کا کوئی با قاعدہ دستور نہ رائج ہے اور نہ اس سمت کوئی واضع رجحان یا انتظام ہے تاہم ایسی محافل کی روداد (سونیر) وغیرہ لکھنے کی شروعات ضرور ہو چکی ہے۔ پھر بھی زیادہ تر کاروایکاں صرف گرمئی محفل تک محدود رہ کر ختم ہو جاتی ہیں اس طرح ان کی افادیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی بہت سے وجوہات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اخبارات ایسے جلسوں کی روداد چھاپنے پر اپنی کاروباری منفعت کے خیال سے آمادہ نہیں ہوتے۔ ان کو عوامی لٹریچر مثلاً جنگ وجدل اور فحاش کے قصے اور سنسنی خیز حالات سے ہی فرصت کہاں جو ادھر ان کی نگاہ اٹھ سکے۔ ادبی رسایل بھی غزلوں افسانوں یا اشتہاروں کے ہی بوجھ تلے ایسے دبے ہوئے ہیں کہ انھیں سر اٹھانے کا موقع ہی نہیں جو اس سمت بھی نگاہ ڈال سکیں۔ اور خاص بات یہ ہے کہ عوام

السناس کو بھی علم وادب یا اس کے بدلتے ہوئے مزاج اور تقاضوں سے کوئی خاص دلچسپی بھی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اخبارات ورسایل کے پیش نظر اقتصادی اور تجارتی پہلو اپنے کاروبار چلانے کے لیے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان روداد کو مرتب کرنے یا قلمبند کرنے کا کوئی واضح رجحان ہے نہ کوئی باقاعدہ انتظام۔ حالانکہ اگر ان تقاریر کو باقاعدہ مرتب کرلیا جائے تو ایک زبردست ادبی اور علمی سرمایہ محفوظ ہوسکتا ہے۔ اختر کی یہ تقاریر ہیئت اور مواد دونوں لحاظ سے کسی ادبی اور علمی مضامین سے کم نہیں ہے۔ درس وتدریس اختر کا زندگی کا مشغلہ رہا اس لیے ان کا مطالعہ بھی وسیع ہے۔ عصری وادب اور عصری تقاضوں پر ان کی نگاہ مستحکم ہے۔ زبان و بیان پر عبور رکھتے ہیں۔ صاف سادہ اور دلچسپ زبان میں اپنے خیالات کی ترسیل کا ہنر رکھتے اسی لیے ان کی تقاریر کسی استاد کی کلاس روم کی روایتی تقریر کی طرح خشک اور بے مزہ نہیں ہوتیں۔ اختر ایک لائق پروفیسر کی طرح اپنے موضوع کو دلچسپ اور پرمزہ بنا کر پیش کرنا بخوبی جانتے ہیں۔ جاں نثار نے انجمن ترقی پسند مصنفیں کے کئی جلسوں میں تقریریں کیں علمی مباحث میں کھل کر حصہ لیا۔ صدارتی خطات بھی دیئے ہیں جو انھوں نے دوبارہ حلقہ ارباب ادب بھوپال کے جلسوں کی مسند صدارت سے کی تھیں۔ ۱۸رنومبر ۱۹۵۴ء کو بھوپال کے ایک جلسے میں اختر نے غزل آزاد نظم گیت اور اردو کی دوسری اصناف پر اظہار خیال کرتے ہوئے غزل کی متعلق انھوں نے یہ پیشن گوئی کی تھی کہ غزل ضرور ترقی کرے گی اور آگے بڑھے گی۔ ان کا یقین تھا کہ

> ’’غزل میں جذباتی رشتہ زیادہ ہوتا ہے۔ بیانیہ نہیں۔ آج کل
> ہیئت کے بارے میں کافی بحث ہورہی ہے اس پر بھی زیادہ زور دیا جا

رہا ہے کہ نئے تجربے ہونا چاہیے مگر ہیئت کے معنی صرف ڈھانچے کے
نہیں ہوتے ہیئت میں صوتی آہنگ۔ الفاظ ترکیبیں اور بہت سی دوسری
چیزیں شامل ہیں اندرونی طور پر ہم غزل کی ہیئت کو متاثر کرسکتے ہیں۔
اور یہ موضوع کی تبدیلی سے ہوگا۔ اور جب موضوع بدلے گا تو کہنے کا
ڈھنگ الفاظ کا آہنگ بھی بدل جائے گا۔'' [۱]

ایک اچھی اور لایق قدر نظم کے متعلق اختر نے یہ خیال پیش کیا تھا

''اچھی نظم کا مطلب یہ تو نہیں کہ اس میں پوری مارکزم کی تھیوری کو
جذب کردیں۔ نظم اور غزل میں ہم ہیئت کا مدنظر رکھ کر تفریق کرسکتے
ہیں نظم ہم کو بیانیہ انداز دیتی ہے ہو جو غزل میں نہیں آتا دراصل بیاں
اور اظہار میں بڑا فرق ہے۔ اعلیٰ شاعری اپنی جگہ اکسپریشن
Expression کی شاعری ہے'' [۲]

نومبر ۱۹۷۰ء میں حلقہ ارباب ادب بھوپال کے زیر اہتمام ایک ''شام اختر'' میں انھوں نے اپنا منتخب غزل سنانے کے ساتھ نئی شاعری کے موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ مقامی اخبارات نے اس جلسے کے حالات بالتفصیل شایع بھی کیے تھے۔ اختر نے اپنی تقریر میں نئی شاعری کے علاوہ شاعری میں علامات۔ لہجہ ہم وجودیت نا وابستگی کا مسئلہ اور دیگر ادبی مسایل پر بھی گفتگو کی۔ انھوں نے جدید شاعری کے دو گروہوں کے نظریات بیان کرتے ہوئے انھوں

---

[۱] روزنامہ افکار بھوپال ۳۰ر نومبر ۱۹۵۴ء ص۲

[۲] روزنامہ افکار بھوپال ۳۰ر نومبر ۱۹۵۴ء ص۴

نے اپنے نہایت حقیقت پسندانہ نظریات کی یوں وضاحت کی۔

''ایک گروہ انتہا پسند ہے۔ جو شعر کہنے کی ذمہ داری کو تو سمجھتا ہے۔لیکن اس کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہیں کہ قاری بھی سمجھ پاتا ہے یا نہیں اس کا کہنا ہے کہ ہم اپنے تاثرات اور محسوسات پیش کرتے ہیں۔اگر سننے والا یا پڑھنے والا اسے نہ سمجھے تو اس میں ہمارا قصور نہیں۔ قصور اس کا اپنا ہے اسے ہمارے ذہن کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔''
دوسرا گروہ قدرے معقولیت پسند ہے وہ ایک طرف روایت سے اپنا رشتہ جوڑتا ہے اسے مانتا ہے اور شعر سمجھنے کی ذمہ داری بھی قاری پر نہیں ڈالتا گویا دوسرے معنوں میں ترسیل کا قایل ہے۔

ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ جدید شاعری نے ہمیں ایک نیا لہجہ دیا ہے الفاظ کے انتخاب اور ان میں نئے خیالات اور لہجے کے ساتھ برتنے میں بعض جدید شاعروں نے کافی محنت کی ہے۔آج کے شاعر کا شعر الگ محسوس ہوتا ہے۔تراکیب اور الفاظ کا استعمال سادہ اور آسان انداز بیان کو اپنانا ان کی شاعری کو ایک نیا آہنگ دیتا ہے۔ یقیناً وہ زیادہ نیچرل لہجے میں اپنی بات کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہماری امیدوں کا مرکز جدید شعرا کا یہی معقولیت پسند گروہ ہے جو ہوا میں قدم رکھ کر نہیں چل رہا ہے۔ بلکہ ان روایات کا پاسدار ہے جو اس نے قدیم ادب سے اپنائی ہے۔'' [1]

---

[1] روزنامہ ندیم بھوپال ۸/نومبر ۱۹۷۱ء ص ۲

ذات کے مسئلہ پر اپنی تقریر میں انھوں نے کہا

''جدید شعرا نے ذات پر کچھ زیادہ ہی زور دے رکھا ہے۔ ہم بھی نہیں چاہتے کہ ذات کے ادب و شعر میں بالکل نظر انداز کر دیں۔ لیکن ان جدید شعرا نے ذات کا جو تصور اپنایا ہے۔ اس میں خامیاں ہیں انھوں نے اس کا تعلق سماج سے توڑ دیا ہے۔ وہ لوگ یہ فراموش کر گئے ہیں کہ ہماری ذات سماج کی دین ہے ہمارا وجود ہمارا علم ہمارا شعور سماج کا ممنون ہے یہ سب کچھ ہم نے سماج سے متعار لیا ہے صرف ذات کوئی چیز نہیں ہے۔ اس لیے ہمارے ادب اور شعر کا رشتہ سماج سے توڑا نہیں جا سکتا'' [۱]

جاں نثار اختر کی نثر نگاری کے مختلف میدانوں مثلاً تبصروں۔ دیباچوں۔ کالم نویس، مضمون نگاری اور صدارتی تقاریر وغرہ کے الگ الگ جائزے سے یہ بات پائے ثبوت کو پہونچتی ہے کہ ان میں اعلی درجہ کی انتشاری صلاحتیں ۔تخلیق کا جذبہ اور خوبصورت اور توانا نثر نگاری کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھیں۔ حالانکہ انھوں نے نثر میں بہت کم ہی لکھا ہے۔مگران کا نثری سرمایہ اپنی افادیت کے لحاظ سے مقدار میں کم ہی سہی لیکن اپنے معیار کے لحاظ سے بے حد وقیع اور اہم ہے۔ اگر ایک جانب وہ شاعری کے افق کے ''اختر تابندہ'' ہیں تو نثر نگاری کے آسمان پر بھی ''نجم الشاقب'' کہے جانے کا بجا طور پر حق رکھتے ہیں۔

---

[۱] روزنامہ ندیم بھوپال ۲ رنومبر ۱۹۷۱ء ص ۲

اختر کے خطوط ۔

اختر کے یہ دونوں کارنامے اور پر وقار انداز میں حالات کا جائزہ اختر کی ناقدانہ صلاحیتوں کا غماز ہے اور ہزاروں باتیں ایک انوکھی طرز کا حامل تذکرہ ہے ۔ بحیثیت کل ان کی تمام نثری نگارشات اردو کے خزانے میں ایسا بیش بہا اضافہ ہیں جنھیں بھلایا نہیں جاسکتا۔ نظم سے الگ ہٹ کر بھی اردو نثری خدمات ان کی حیات دوام کی ضامن ہیں۔

(باب ششم)

جاں نثار اختؔر کے کلام کا مجموعی تنقیدی جائزہ

جاں نثار اختر بنیادی طور سے ایک نظم گو کی حیثیت سے اپنی شناخت رکھتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک ہمہ جہت اور ہشت پہلو شخصیت اور صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ ان کی ہمہ دانی کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اردو شاعری کی جملہ اصناف۔ غزل۔ نظم۔ مثنوی۔ رباعی۔ قطعہ مرثیہ میں طبع آزمائی کر کے اپنی جودت فکر جولانی طبع۔ شعری لطافت اور تخلیقی توانائی کا مظاہرہ کیا تو ساتھ ہی نثر میں تبصرہ نگار، قابل قدر دیباچہ نویس۔ مقرر، اور عصری ہیئت اور بیدار مغز رکھنے والے کالم نویس بھی تھے۔ جاں نثار کی غزلیں اگر ایک طرف حسن و عشق کا نازک اور لطیف نفسی کیفیات رنگینی اور موسیقت سے عبارت ہیں تو دوسری طرح ان میں واضع طور پر سیاسی شعور، سماجی ادراک اور مخصوص زاویہ فکر کا ثبوت بھی فراہم ہوتا ہے۔ ان کی شاعری کی روح کلاسیکت۔ رومانیت اور دور جدید کی تنقیدی اصطلاح۔ عصری ہیئت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ ان کی شاعری صوتی اور معنوی دونوں اعتبار سے نئی منزلوں کا پتہ دیتی ہے۔ انھوں نے گھریلو زندگی کی رومانی اور شعری فضا سے بھی اپنی بساط سخن سجائی ہے خاص کر گھر آنگن میں رباعیوں کے وسیلے سے ازواجی زندگی کے سکھ اور شادمانی اور چھیڑ چھاڑ کو بھی موضوع بنا کر اردو شاعری میں ایک نئی جوت جگائی ہے۔ جاں نثار ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعرا میں ایک امتیازی اور انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے نظموں میں رومانیت کے پہلو بہ پہلو سیاسی اور سماجی موضوعات کو بھی نہایت فنکارانہ شعور اور دل کش پیرایہ میں پیش کیا ہے۔ جاں نثار جوش کی طرح بلند آہنگ اور گھن گھرج کے شاعر نہ ہو کر مدھم لہجہ کے شاعر ہیں۔ ان کے لہجہ میں جھرنوں میں قلِ قل بھونروں کی گنگناہٹ اور بلبل کی چہک اور کوئل کی کوک کا احساس شعریت کے حسن کو چار چاند لگاتا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے

شاخ گل پر بیٹھ کر بھونرا کوئی
مستیوں میں جھوم کر یوں گنگنائے
جس طرح سے میکدے میں مطربہ
دھیمے دھیمے ساز پر اک گیت گائے

حقیقت کہ دھیمی لے (मध्यम स्वर) میں جو کشش جاذبیت ہے اسے کوّے یا گدھے کی کرخت آواز سے نہیں حاصل کیا جاسکتا۔ جاں نثار کی شاعری اسی لیے صوتی اور معنوی اعتبار سے اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔ پروفیسر سید احتشام حسین صاحب نے ان کی نظموں کا جائزہ لیتے ہوئے اس طرح لکھا ہے۔

’’جہاں تک جاں نثار کی شاعری کو میں نے سمجھا ہے یہی نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوں کہ مسائل حیات کے سمجھنے سلجھانے ان پر قابو پانے اور اس سے لطف حاصل کرنے کی کوشش وہ کرتے ہیں یا جو صورتیں انھیں پیش آتی ہیں۔ وہ انھیں کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔ اختر کی شاعری سے اختر کی واقفیت علم اور حقیقت پسندی کا اندازہ ہوتا ہے اس سے اس قدرت بیان کا بھی پتہ چلتا ہے جو ہر شاعر کو عطا نہیں ہوتا۔ اختر کی شاعری میں رنگینی اور موسیقیت عام طور سے پائی جاتی ہے اور گو کہیں کہیں مسرت احساس کی کمی سے نظم ہلکی پھلکی چیز بن جاتی ہے لیکن

اس کے انداز بیان سے بڑی حد تک اس کی تلافی ہو جاتی ہے۔'' [۱]

جاں نثار کی شاعری کی فہرست کافی طویل ہے۔ انھوں نے رومانی۔ سیاسی۔ سماجی۔ انقلابی غرضیکہ ہر قسم کے موضوعات پر اپنے افکار نظم کیے ہیں۔ ان نظموں میں جذبے کی گہرائی احساس کی نرم آنچ اور دل کے دھڑکنے کی وہ ادا پائی ہے جو روح مین سرایت کر کے دل کے تاروں کو جھنجنا دیتی ہے۔ ان کی شاعری میں سادگی فطری صداقت فکر کی گہرائی اور نغمگی کے وہ اوصاف ہیں جو اسے حیات دوام عطا کرنے کے لیے کافی ہیں۔ جاں نثار کی شاعری بنیادی طور پر انسانی محبت سے معمور ہے۔ اگر اس کے معنون کو ذرا وسعت دی جائے تو یہی محبت سماجی اعتبار سے غم صاباں کے نام سے شروع ہو کر غم دوراں کے روپ میں بدل جاتی ہے ان کا سلیقہ یہ ہے کہ وہ بڑے سلجھے انداز میں فرد اور سماج کے باہمی رشتہ پر اہم اور مفید روشنی ڈالتے ہیں۔ اور کبھی فرد اور سماج کو اپنے انفرادی پیکر میں پیش کرتے ہیں اور ہر موقع پر وہ فرد کو سماج پر فوقیت دیتے ہیں کون سا گیت سنو گی انجم اور زندگی میں اس قسم کی کیفیات نظر آتی ہیں۔ یہی کیفیات جاں نثار کے علاوہ۔ جذبی۔ مجاز۔ فیض۔ سردار جعفری اور دوسرے ترقی پسند شعرا کے یہاں بھی نظر آتی ہیں۔ ان کی نظموں میں انسان اور زندگی کی بھرپور محبت کی ترجمانی کی گئی ہے۔ جاں نثار بنیادی طور محبت کے شاعر ہیں۔ انھوں نے انقلاب کے گیت بھی گائے ہیں اور سیاسی نظمیں بھی لکھیں مگر ہر جگہ اس جذبے کے ساتھ کہ امن و عافیت انسان کا مقدر بن جائے۔ اور امن داماں کی فضا میں محبت کا گلشن شاداب ہو جائے ۱۹۴۲ء میں جوش نے اختر کی شاعری کے سلسلے میں سلاسل کے دیباچے میں اپنی یہ رائے پیش کی ہے۔

---

[۱] تلاش فردا کا شاعر از احتشام حسین۔ فن اور شخصیت جاں نثار اختر۔ نمبر ص ۴۰۔۴۱

''اختر کی شاعری میں ہمیں زندگی کی حقیقتی مناظر کی دلفریباں۔
نفسیات کی باریکیاں اور رومان کی برنائیاں ملتی ہیں۔ اور یہ سب
چیزیں ایسی سموئی ہیں جس طرح کوئی نباض موسیقی متعدد راگینوں کو ملا
کر ایک ایسا نغمہ شیریں پیدا کرتا ہے کہ بزم پر وجد کی سی کیفیت طاری
ہوتی ہے۔ اس کے دوش بدوش اختر کی شاعری میں جو انقلابی عنصر ہے
وہ اس قدر جاندار اور جاندار کے ساتھ دلکش و ہموار کی دلوں پر براہ
راست اثر کرتا ہے۔''......اختر ہماری جدید شاعری (اور جدید
شاعری اصلی شاعری ہے) کے ایک اختر تابندہ ہیں۔ ایک ایسے اختر
تابندہ جس کے اندر آفتاب چھپا ہوا ہے۔ اور جو یکا یک پوری دنیا کی
تابنا کی کے ساتھ دنیائے ادب کو جگمگا دینے والا ہے'' [1]

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے مشاہد قلمکار اور اساتذہ اور قد آور شخصیات آرا کو بھی پیش کر دیا جائے جو اختر کے فن اور کمال اور ان کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ کسی نے صحیح ہی کہا ہے ؎

خوش تر آں باشد کہ مردِ دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

[1] سلاسل از جاں نثار اختر دیباچہ محررہ جوش ملیح آبادی

اس ضمن میں ڈاکٹر ظ انصاری اختر کی شاعری کے متعلق رقمطراز ہیں۔

''لفظوں کا بہاؤ اور جدید ترنم جاں نثار اختر کے یہاں اس مقام پر پہونچ گیا ہے۔ کہ الفاظ شاعر کے ارادے اور اس کے مشورے سے بے نیاز خود بخود ایک ترتیب اور سلیقہ کے ساتھ جڑے ہوئے لگتے ہیں۔ جیسے ندی کے نرم بہاؤ پر دپٹے کی قطاریں یا پھولوں کی مالائیں جاں نثار کی شاعری کا لباس ریشمی ہے۔صرف ریشمی میں نہیں کہیں کہیں گوکھرو کی گوٹ لگی ہوئی ہے۔کانٹے سے چبھتے ہیں۔لفظوں کی تکرار و کثرت نے جھاڑ ا اور پھندے میں ٹانک رکھے ہیں اس نے اپنی شاعری کو صورت و معنی دونوں اعتبار سے مسلسل اور نگین دائرے کی صورت دے کر اطمینان حاصل کر لیا ہے۔ کہ شاعری کی صحیح قدر و قیمت آج کا زمانہ بھی دے گا اور بعد کا زمانہ جو دگز رنہیں کیا کرتا۔'' [1]

پرکاش پنڈت بنیادی طور سے ہندی ادیب ہیں انھوں نے اختر کی شاعری سے متاثر ہو کر اپنے خیالات کو یوں ظاہر کیے ہیں..

''وہ (جاں نثار اختر) کبھی مستقبل سے نا امید نہیں ہوا اس کی شاعری اس احساس سے پیدا ہوئی ہے کہ آج کی زندگی کی جدوجہد آنے والے کل کی خبر دیتی ہے۔اس لیے زندگی کی جدوجہد کی تلخیوں سے گھبرانا نہیں چاہیئے ۔آج اس کی شاعری میں سماجی حقیقتوں کا گہرا

[1] جاں نثار اختر اور اس کی شاعری ظفر انصاری اور شخصیت جاں نثار اختر نمبر ص ۵۰

عکس ہے اور اس کا موضوع سخن وہ انسان ہے جو سماج اور قدرت پر فتح
پا لینے کے بعد حسین دلفریب اور پر سکون زندگی قایم کرنے کے لیے
جد و جہد کرتا ہے'' [۱]

سیاسی شعور کی حد درجہ پختگی کے ساتھ ساتھ جاں نثار کی رومانی شعور بھی بہت پختہ ہے۔ اور اس میدان میں ان سے لغزشیں کم ہی ہوئی ہیں۔ اس کی وجوہات یہ سمجھ میں آتی ہیں کہ انھیں شاعری کرنے پر ماہرانہ قدرت و شعور حاصل ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اختر نے قدیم وجدید ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے اس لیے وہ ادب کی اپنی ذاتی صلاحیتوں کو پوری اہمیت دیتے ہیں۔ اختر کی ابتدائی دور کی شاعری پر جوشؔ کا نمایاں اثر جھلکتا ہے۔ لیکن بعد میں دھیرے دھیرے انھوں نے خود کو جوشؔ سے الگ لہجہ دیا۔ چنانچہ اسی قدیم وجدید کے حسین امتزاج نے نئے خاکے بنائے اس طرح جوشؔ کے بعد کے شعرا مجازؔ۔ فیضؔ۔ جذبیؔ۔ سردار جعفری کے ساتھ ان کا نام بھی شامل ہے۔

سالک ہاشمی لکھتے ہیں..

''ترجمان زندگی۔ مصوّر فطرت ماہر نفسیات۔ رومان کا رسیا اور
انقلاب کا نقیب جاں نثار اختر اپنی جن صلاحیتوں کو لے کے اٹھا ہے وہ
بہت زریں اور مستحکم ہیں۔ وہ متضاد راگینیوں کو ملا کر ایک ایسا نغمہ
شیریں پیدا کرتا ہے جس سے طبیعت میں وجد طاری ہو جائے۔
جذبات میں جوانی فنکار حقیقت میں وہی ہے جو دل و دماغ کو اپنے

---

[۱] جاں نثار اختر جیون اور سنکلن (ہندی) مرتبہ پرکاش پنڈت ص ۱۹۔۲۰

تصورات میں ڈھال لے اور عزائم کو بیدار کر دے خود زندگی ہی سے
کھیلے اور زندگی کی مسائل پیش کرے'' [1]

یہ درست ہے کہ جاں نثار اختر نے شاعری کی ابتدا غزل سے کی تھی۔ مگر ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو جانے کے بعد انھوں نے غزل گوئی یک لخت ترک کر دی تھی یہی وجہ ہے ان کے پہلے مجوعے کلام سلاسل میں کوئی غزل شامل نہیں ہے بعد کے مجموعوں جیسے جادواں، نذرِ بتاں یادگر یباں اور خاک دل میں بھی غزلوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اس طرح ایک طویل عرصہ غزل سے الگ ہو کر گذارنے کے بعد انھوں نے پھر اس جانب بڑی شد و مد سے رخ کیا غزل کے مجموعہ پچھلے پہر کی اشاعت نے تو ادبی حلقوں میں خوشی کی ایک نئی لہر دوڑا دی۔ جاں نثار کی پچھلے پہر میں شامل غزلیں ان کے پختہ فنی شعور اور بالغ النظری کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ جاں نثار کے فعال اور متحرک ذہن۔ تخلیقی توانائی اور قدرت بیان کا بھی احساس دلاتی ہیں۔ پچھلے پہر کے دیباچے میں پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں..

''جب جاں نثار فلمی دنیا کی رنگینیوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ تو
کچھ لوگوں کو یہ خیال ہو چلا تھا کہ وہ اس دور کے تازہ ترین میلانات اور
نئی فکر اور نئی ہئیت سے لازماً دور ہو گئے ہوں گے۔ مگر اس شاعر کا عجوبہ
یہ ہے کہ ایسی کاروباری دینا میں بھی اس کی نگاہیں دل کے داغوں پر
رہی۔ اور دل نئی نسل کے ساتھ دھڑکتا رہا۔ یہ غزلیں۔ مشعور'' کی اس
حکایت اور اس کی بلاغت۔ اشارات اور ادا کا صحیفہ ہیں'' [2]

---

[1] ترقی پسند ادب اور جاں نثار اختر از سالک ہاشمی ماہنامہ افکار بھوپال نومبر ۷۴ ص ۵۱

[2] پچھلے پہر از جاں نثار اختر دیباچہ محررہ آل احمد سرور ص ۰۹

جاں نثار کی ان نئی غزلوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے ممتاز مارکسی ناقد پروفیسر محمد حسن نے لکھا ہے۔

''جاں نثار اختر کی شاعری کا نیا لب ولجہ چند سالوں کا سب سے اہم اور خوشگوار ادبی حادثہ ہے۔ جاں نثار اختر ان قدما میں سے ہیں جو قدیم ہونے سے انکار کرتے ہیں۔ جن کی خاموشیاں بھی مٹھاس کے بجائے فکر کی بلاغت سے معمور ہیں یعنی اسی وقت جب اردو شاعری کے مورخ انھیں فیضؔ۔ مجازؔ۔ مخدومؔ اور جذبیؔ کی صف میں سجا کر طاق نسیان کی زینت کرنے کی تیاری میں مصروف تھے۔ نقاد اپنی درجہ بندیوں سے مطمئن اور جاں نثار نوازوں کی خاموشیوں پر قانع ہو چکے تھے۔ بڑے غیر متوقع انداز میں جاں نثار اختر نے پھر نغمہ سرائی شروع کر دی اور تعجب یہ ہے کہ نغمہ سرائی ماضی کا تسلسل یا پرانی دھنوں کی حکمراں نہ تھی۔ ایسے نرالے اور شگفتہ نغموں سے عبارت تھی کہ بس جسے اپنے نغموں کو مقدس آتش خانوں کی آگ روشن کر کے جل جانے والے ''مرغ آتش نوا نے'' دوسرا جنم لیا ہوا ایسا نیا جنم کہ پرانے جاننے والوں کے لیے بھی یہ یقین کرنا مشکل ٹھہرا کہ کلام کے یہ دونوں رنگ ایک ہی شاعر کی تراش فکر ہیں۔''[۱]

اسی طرح ایک دوسرے ممتاز ناقد جناب باقر مہدیؔ نے جاں نثار اختر کی غزلوں کو ایک

---

[۱] پچھلے پہر دیباچہ ص ۱۳

نئے بانکپن سے تعبیر کیا ہے..

''پچھلے پہر میں جاں نثار اختر نئے بانکپن سے ابھرے ہیں ان کا عشق بھی ''خاک دل'' کی نظموں سے بہت مختلف ہے ان کے کلام میں جنسی تلا فدہ حسن کی ادائیں اور عشق کی سرشاری کا ایک نیا سنگم ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک خاص قسم کا ٹھہراؤ جس کے بغیر اتنی تاثیر نہیں ابھرتی'' [۱]

مشہور ناقد اور جدیدیت کے نظریہ ساز شمس الرحمان فاروقی کا تجزیہ ہے کہ

''اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ہمارے عہد کی شاعری میں جاں نثار اختر کی غزل اپنی مضبوط انفرادیت شائستگی اور درون بینی اور رسکہ بند تصورات سے بے خوف ہو کر شاعرانہ اظہار پر اصرار کی وجہ سے نمایاں ہے۔'' [۲]

جاں نثار کی غزلوں کا تجزیہ کرتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں..

''جاں نثار اختر کی نئی غزلیں ان کی پچھلی شاعری سے مختلف ہیں انھوں نے پہلی بار حقیقت کو پوری ذمہ داری کے ساتھ دیکھا ہے اور ذہنی جرأت سے کام لیتے ہوئے صداقت کی جیسی وہ ہم عصر تجربے میں انھیں ملی ہے پیش کیا ہے'' [۳]

---

[۱] نئی غزل باقر مہدی فن اور شخصیت جاں نثار اختر نمبر ص ۱۷۷

[۲] [۳] اختر اور نیا استعارہ شمس الرحمٰن فاروقی ص ۱۷۷

جناب وارث علوی رقم طراز ہیں۔

''پچھلے پہر کی یہ غزلیں جان نثار کے شاعرانہ احساس کا ایک نیا موڑ ہیں۔ ان کی غزلوں میں اس صورت حال کا بیان ہوا ہے جو شکست خواب کی پیدا کردہ ہے اور جس کی آگہی جدید زندگی کے مشاہدے اور جدید شاعری کے مطالعہ کی مرہون منت ہے پچھلے پہر کی غزلوں میں وہ موضوعات جو جدید یہ شاعر کے زخمی احساس کے ترجمان ہیں۔ اور جو جدید آدمی کے کرب کی تصویر ہیں۔ شخصی پیرائے میں نہیں بلکہ دوسرے آدمی کے غم کی صورت میں سامنے آئے ہیں۔

مجھ سے نظریں کو ملاؤ کہ ہزاروں چہرے
میری آنکھوں میں سلگتے ہیں سوالوں کی طرح

مذکورہ بالا تنقیدی آرا کی روشنی میں جاں نثار کے ادبی اور شاعرانہ مرتبہ کا تعین کوئی دشوار مرحلہ نہیں رہ جاتا اس میں شک نہیں کہ اختر ایک بلند پایہ نظم نگار اور صاحب طرز غزل گو ہیں۔ عشقیہ جذبات اور معاملات کے اظہار میں حقیقت نگاری گھریلو پن اور محبوب سے اپنائیت کا احساس ہے۔ مفتی تبسم کا یہ کہنا درست ہی ہے کہ..

''ان کی غزلوں میں عاشق و محبوب کی جو سیرتیں ابھرتی ہیں۔ وہ دوسروں سے مختلف ہیں۔ ان کی الفرادیت اور خوبی یہ بھی ہے کہ اردو غزل جس میں عام طور سے محبوب کو تذکیر کے روپ میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن اختر کی غزلوں میں ایسے اشعار بھی نظر آتے

ہیں جن میں محبوب صرف صنف نازک ہی ہے وہ ہمارے سماج کی زہرہ
جبیں اور حسن مجسم ہے۔ جاں نثار اختر اپنی غزلوں میں انفرادیت اور
درد بینی کے ساتھ شاعرانہ اظہار کرتے ہیں ان کا لہجہ نرم اور سبک
ہے۔انھوں نے اردو شاعری کو ایک نیا تجربہ اور نیا آہنگ اور نیا تصور
دیا ہے۔

جاں نثار نے نظموں غزلوں کے علاوہ بھی گیت رباعی اور قطعہ میں بھی اپنی جولانی طبع کے جوہر دکھائے ہیں جن پر پچھلے باب میں سیر حاصل بحث کر کے ان کے مرتبہ کو متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاہم اس باب کے تقاضے کے تحت اختر کی ان اصناف پر طبع آزمائی کی خوبیاں مجموعی طور سے نمایاں کی جاتی ہیں۔

گیت:۔ جاں نثار نے فلموں کے لیے بائیس سال تک فلمی اس دنیا سے وابستہ رہ کر گیت لکھے ترقی پسند تحریک سے وابستہ شاعروں میں میراجی اور عظمت اللہ خان کے نام ایسے ہیں جنھوں نے اپنے اظہار خیال کے گیت کو وسیلہ بنا دیا۔ حالانکہ گیت نگاری کی ابتدا امیر خسرو سے ہوتی ہیں جنھوں نے اردو فارسی سے آمیز ایک نئی زبان تشکیل کی ہے اس میں اپنی گیت نگاری کے جوہر دکھائے اور اس صنف کو مقبولیت بخشی تھی۔ اس کے بعد نظیر اکبر آبادی نے اس صنف کو پروان چڑھایا۔ اور ترقی دی اور اسے استحکام عطا کیا۔ جاں نثار اختر نے بھی فکر معاش میں فلمی دنیا میں پہونچکر رومانی گیت لکھ کر اپنا مرتبہ و مقام مختص کیا تھا۔ ان کی چند فلموں کے نام جس کے لیے انھوں نے بہت سے فلموں کے لیے گیت لکھے ان میں سے چند نام ہیں۔ سی آئی ڈی۔ ڈنکا۔ انارکلی۔ پیاسا۔ میرا بھائی۔ نیا انداز اور سویتا وغیرہ ان کے گیتوں کے رنگ کو سمجھنے کے

لیے ''پریم پربت''، فلم کا یہ بند ملاحظہ ہو اس میں اختر کی رومانیت چھلکتی محسوس ہوتی ہے۔

یہ دل اور ان کی نگاہوں کے سایے
مجھے گھیر لیتے ہیں باہوں کے سایے
لپٹتے یہ پیڑوں سے بادل گھنیرے
یہ پل پل اجالے یہ پل پل اندھیرے

جہاں تک گیت نگاری کا سوال ہے ایک گیت کار کی حیثیت سے اختر کا مرتبہ بہت بلند اور عظیم ہے۔

رباعی: اردو کی مشکل ترین صنف سخن ہے۔فنی اصطلاح میں یہ چار مصروں کی شاعری ہے پہلے تین مصروں میں تمہید ہوتی ہے اور چوتھا مصرعہ حاصل کلام ہوتا ہے۔ رباعی کے اوزان مقرر ہیں شجرۂ اخرب اور شجرہ اخرم کے اوزان سے الگ ہٹ کر رباعی دوشعر۔ یا قطعہ تو ہوسکتا ہے لیکن رباعی نہیں۔ اس لیے یہ صنف مشکل ترین وقایع سے تعبیر کی گئی ہے وؔلی اور سراؔج اور رنگ آبادی سے لیکر عہد جوؔش رواں اور فراؔق تک رباعیاں کافی اچھی اور بلند پایہ لکھی جاتی رہی ہیں۔ جاں نثار اختر نے بھی اسی میدان میں قدم رکھا اور حیرت انگیز طور پر اپنی جولانی طبع کے جوہر دکھائے ہیں۔ جاں نثار نے ازواجی زندگی کے دکھ سکھ کے فنکارانہ اظہار کے لیے اس کو وسیلہ اظہار بنایا ہے۔ وہ اردو شاعری میں پہلے ایسے شاعر ہیں جنھوں نے خیالی یا تصوراتی محبوب کے بجائے بیوی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ گھر آنگن کی رباعیاں محبت وفا۔ خلوص ۔ رفاقت کی

خوشبو سے پوری طرح معطر ہیں۔انھوں نے عورت کو بے وفا اور ہر جائی بنا کر نہیں دکھایا بلکہ اسے ایثار و وفا کے پیکر کے روپ میں پیش کیا ہے صرف ایک رباعی بطور نمونہ ملاحظہ کیجئے اس رباعی میں عورت کے ایثار اور قربانیوں کا یہ جذبہ ملاحظہ ہو۔

کہتی ہے سہہ لوں گی جو سہنے پڑے غم
کچھ دیر کے لیے اور ہیں زمانے کے ستم
تم اپنے ارادوں کو نہ کرنا کمزور
پیچھے نہ ہٹانا کہیں گھبرا کے قدم

جاں نثار کی رباعیات کے مجموعے گھر آنگن کا دیباچہ کرشن چندر نے تحریر کیا ہے۔ان کا یہ تجزیہ صدفی صد درست ہے کہ ''اختر کی رباعیوں میں اس کے ماضی اور حال ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کھڑے ہیں اور اختر کے فن کو نکھرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں''

قطعات:۔ جاں نثار نے رباعیوں کے علاوہ قطعات بھی کہے ہیں۔ماہرین فن نے قطع کی غرض و غایت یہ بیان کی ہے کہ یہ ''ایک حقیقت کی جھلک دکھانے کے لیے وجود میں آیا''یعنی قطعہ میں ایک مرکزی موضوع کا وجود ضروری ہے جاں نثار کے قطع اس تعریف پر پورے اترتے ہیں۔ڈاکٹر اقبال اور ظفر علی خاں نے اس صنف کو اپنایا اور پروان چڑھایا عہد جدید میں اختر انصاری نریش کمار شاد اور احمد ندیم قاسمی کے نام خصوصی طور سے قطعات نظم کرنیوالوں میں شامل ہیں۔جاں نثار نے بھی متعدد رومانی قطعات لکھے ہیں حالانکہ ان کی تعداد بہت کم ہے اس کی

باوجود ان کی افادیت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اختر رومانی شاعر کی حیثیت سے شہرت پذیر ہیں ان کے قطعات میں ان کا یہ مخصوص رنگ بہت شوخ نظر آتا ہے۔ حسن کی مرقع کشی کرنے کے علاوہ اختر نے اپنے رومان پرور ماضی کی یادوں کو بھی قطعات کی صورت میں بیان کیا ہے۔ یہی یادیں اختر کی زندگی کی قیمتی اساس ہیں چند قطعات ملاخطہ کیجئے۔

رات جب بھیگ کے لہراتی ہے
چاندنی اوس میں بس جاتی ہے
اپنی ہر سانس میں مجھکو اختر
ان کے ہونٹوں کی مہک آتی ہے

اور یہ قطعہ بھی ملاخطہ کیجئے

کتنی معصوم ہیں تیری آنکھیں
بیٹھ جا میرے روبرو میرے پاس
ایک لمحے کو بھول جانے دو
اپنے ایک ایک گناہ کا احساس

جوش نے ایک موقع پر اختر کو اردو شاعری کا اختر تابندہ کہا تھا۔ یہ فرسودہ اس وقت بھی

درست اور آج بھی صحیح ہے اس کے باوجود حیرت ناک امر یہ ہے کہ ایسے لائق قدر فنکار کے باب میں ہمارے متعدد سخن شناس ناقدوں نے ان کی شاعری کا بالاستعاب بر تکز کر کے ان کے مرتبہ و مقام کو اجاگر کرنے کی چنداں ضرورت محسوس نہیں کی صرف سرسری جائزے پر اکتفا کی گئی ہے۔

نثر نگاری:۔ جاں نثار کے ادبی سفر پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے دور طالب علمی سے ہی تنقیدی مضامین لکھنے کی شروعات کر دی تھی۔ جو ان کی نثر نگاری اور خاص کر ان کی تنقیدی بصیرت پر دلالت کرتی ہے انھوں نے علیگڈھ کالج میگزین کے مدیر کی حیثیت سے پر مغز اداریہ تحریر کرنے کے ساتھ میگزین میں اپنے کچھ تاثراتی قسم کے مضامین بھی قلمبند کر کے اپنے قلم کا لوہا منوالیا ہے۔ بحیثیت نقاد کے اختر کا زبردست کا زمانہ مضطر خیر آبادی کی ہندی شاعری پر تنقید ہے۔ جس میں اختر کی فنی چابکدستی۔ قدیم ادبی سرمایے سے کامل واقفیت روایات سابقہ سے باخبری۔ تجزیہ و تحلیل۔ قابل ذکر ہندی شاعروں کے کلام کے آئینہ میں مضطر کی شاعری کا تقابلی مطالعہ اور ہند کے مسلمان کی خدمات پر بالتفصیل روشنی ڈالی ہے اخبار بلٹر ز کے ایک کالم نویس کی حیثیت سے انھوں نے ہزاروں باتیں قلمبند کر کے شعرا کی نجی زندگی۔ بے تکلف دوستوں سے گفتگو فراق اور مجاز کی بذلہ سنجی حاضر جوابی اور شگفتہ مزاجی کا بھرپور ذکر کیا ہے۔ ہزاروں باتیں میں ترقی پسند شعرا کے افکار نظریات پر روشنی ڈالنے کے ساتھ اس عہد کی متعدد ادبی شخصیتوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس سے یہ مجموعہ ہزاروں باتیں کی شکل میں اردو نثری نگاری کا ایک خوبصورت مرقع اور اردو سرمایہ ہی ایک بیش قیمت اضافہ اور نیا رجحان ہے۔

اس سے قبل ایسی کوئی روایت سامنے نہیں ہے جاں نثار کی یہ پہلی ادبی کاوش یقیناً مستقبل

کے لکھنے والوں کو ایک نئی راہ دکھاتی اور نئی تحریک عطا کرتی ہے۔

جاں نثار اختر کی نثر نگاری کے مختلف میدانوں کے الگ الگ جائزے سے یہ بات پائے ثبوت کو پہونچتی ہے کہ ان میں انتقادی صلاحتیں۔ مضمون نگاری کا ہنر اور تحقیق کا جذبہ اور توانا نثر لکھنے کی بھر پور صلاحیت تھی اور یہ کہ وہ شاعری کے میدان میں جس مقام پر فائز ہیں اس سے کم مرتبہ اور خدمات ان کی نثر نگاری میں کسی طرح سے نہیں کہا جا سکتا۔ یہ خاص عطیہ پروردگار ہے کہ ان کی گرفت اردو نثر نگاری میں جتنی مضبوط ہے اس قدر ان کی فکر ونظر اردو شاعری پر بھی قوی ہے۔ ان کا کلام آپ بیتی سے لبریز ہوکر ہم کو اپنے دل کی بات لگتی ہے۔ یقیناً ایک لایق فخر شاعر۔ گیت کار۔ مبصر اور نقاد مضمون نگار کالم نویس اور خطوط نویس کی حیثیت سے ان کا نام نا قابل فراموش ہے۔

(باب ہفتم)

حرف آخر

حرف آخر

اکثر بہت کچھ اطوار وخصایل اولاد کو والدین سے بطور وراثت حاصل ہوتے ہیں۔ جاں نثار کے ادبی ذوق کا یہی معاملہ ہے ان کے والد مضطر خیرآبادی صاحب طرز شاعر تھے۔ گھر کا ماحول شاعرانہ تھا۔ جاں نثار نے اسی ادبی ماحول میں ہوش سنبھالا۔ ابھی مکتب میں مولوی صاحب کے روبرو زانوئے تلمذ تہ بھی نہ کیا تھا کہ ان کا بچپنا داخلی اور خارجی زندگی کے تصادمات سے آشنا ہونا شروع ہوگیا تھا، جس سے آگے چل کر ان کی شعری زندگی میں طرز قدیم کا احترام بھی رہا اور جدید طرز نے بھی اپنی آغوش التفات ان کے ذوق وفکر کے لیے کھول دی تھی۔ جاں نثار کا ہنر یہ ہے کہ انھوں نے قدیم وجدید کا ایسا توازن برقرار رکھا کہ ان کی شاعری رنگینی دل پذیری اور موسیقیت کا مرقع بن کر لفظوں کے سیدے سادے استعمال کے باوجود ایک نکھرے ہوئے روپ میں سنور کر سامنے آئی ہے جاں نثار کے بارے میں قرۃالعین کا یہ جملہ درست ہے۔

''وہ اس پائے کے شاعر ہیں کہ ظاہر ہے Self Cohseious قسم کی جدید شاعری نہیں کریں گے (وہ خود کہتے ہیں کہ انھوں نے کیٹس اور بائن کے بعد انگیریزی شعرا کو نہیں پڑھا) ان کی اسی سادہ اور سوز اکہری شاعری میں کہیں کہیں قدیم چین اور جاپان کی جھلک نظر آتی ہے۔ جہاں چاند اردو فارسی کے محبوب کا چہرہ یا جدید شاعر کا سڑا ہوا خربوزہ نہیں تھا۔ لیکن بڑا خوبصورت چاند تھا۔ جاں نثار اختر اب بھی براہ راست بات کرتے ہیں۔

بیلا ہو کیتکی ہو چمپا کی چاندنی

ہر پھول سے قریب تھے ہم اپنے گاؤں میں

جاں نثار کی شاعری کی انفرادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہندوستانی پن اور ہندوستانی فضا سانس لیتی ہے۔ وہ اپنے اشہب فکر کو وادی بحر کے بگولوں میں سرگرداں ہونے یا عرب کے ریگستانوں اور سنگلاخ زمینوں پر گرگ وتازہ دکھانے کے لیے اذن خرام نیں دیتے بلکہ ہندی کے ہی الفاظ، تشبیہیں محاورے سادگی روانی اور ہندی کے بھولے پن کا اندازہ اختیار کرتے ہیں ان کے یہاں شاعرانہ مزاج کے ساتھ ایک حسین قلندرانہ انداز ہے۔ جو ان کی شخصیت کھرے پن کا مظہر ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور ان کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''جاں نثار نے کالج میں اردو کی تعلیم بھی دی ہے فلمیں بھی بنائی ہیں ہر طرف لپکے ہیں اور ہر شعلے کی طرف ہاتھ بڑھایا ہے اس کے ساتھ ساتھ دامن جلائے بھی ہیں ہر ہوا کی موج پر روشنی کی کرن ہر خوشبو کے جھونکے کے لیے دیدہ دلی کھول رکھے ہیں۔ مگر اپنے آپ کو انھوں نے چوکھٹے میں اسیر نہیں کیا۔ انھوں نے کبھی کبھار نعرے بھی لگائے ہیں مگر ان کی شاعری نعروں کی نہیں دل کی آواز ہے'' [۱]

جاں نثار اختر نے ایک عام انسان کی ہر روز بسر ہونے والی زندگی کا قریبی مشاہدہ کرتے ہوئے اس کی کامیابیوں سے نامرادیوں، محرومیوں، تلخیوں شکستوں کی جو عصر حاضر کی دین ہے اپنے اندر جذب کر لیا ہے اس ساگر متعن سے نکلا ہوا زہر ان کے لطیف فکر تخیل سے امرت بنکر برآمد ہوتا ہے جو دیدہ دل کو مست و سرمشار کرتا ہے۔ ان کی شاعری، کلاسیکیت رومانیت، مشرقی پرستی، مغرب پسندی کے حسین امتزاج اور نظریاتی شاعر کا ایسا مرقع ہے جس

---

[۱] جاں نثار اختر فن اور شخصیت نمبر آل احمد سرور

میں حسن بھی اور خوشبو بھی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں۔

"جاں نثار اختر کی نئی غزلیں اس لحاظ سے پچھلی شاعری سے مختلف ہیں کہ انھوں نے پہلی بار حقیقت کو پوری ذمہ داری کے ساتھ دیکھا ہے اور ذہنی جرأت سے کام لیتے ہوئے صداقت کی جیسی ہم عصر تجربے میں انھیں ملی ہے پیش کیا ہے۔" [۱]

جاں نثار کے لہجے میں غزل کی راویت بہت نمایاں رہتی ہے۔ کسی طرح کے غیر روایتی بیان کے باوجود ان کا اندازہ بیان روایت سے وابستہ رہتا ہے۔ ان کی غزل میں نیا لہجہ رسم و رواج یا فیشن زمانہ کے طور پر نہیں آتا۔ وہ لفظوں کو یہاں تک برتتے ہیں جنھیں غزل کی روایت اگر نہ بھی برداشت کرتی ہے تو بھی رنگ تغزل ہلکا نہیں پڑتا۔

عشقیہ جذبات کے اظہار کے معاملے میں، حقیقت نگاری، گھریلو پن، محبوب سے اپنائیت کا احساس بلاشبہ دوسرے شعرا کے یہاں بھی مل جائے گا لیکن جاں نثار کی غزلوں میں عاشق و محبوب کی جو سیرتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ وہ دوسروں سے الگ اور منفرد ہیں۔ اس انفرادیت کا ایک خاص وصف یہ بھی ہے کہ اردو غزل جس میں عام طور سے محبوب کے صفیہ تذکیر ہی کو روا رکھا گیا ہے جاں نثار کے یہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں ہے جس میں محبوب صنف نازک کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ بلکہ وہ ہمارے معاشرہ کی ماہ پارہ اور حسن مجسم ہے۔ اختر دھیمے اور مدھم لہجے کے شاعر ہیں............انھوں نے اپنے معتدل مزاج سے کام لیتے ہوئے اندر ہی اندر موجزن رہنے والے مشکل ترین موضوع سے پورا پورا انصاف کیا ہے اور اردو شاعری کو ایک نیا

....

[۱] جاں نثار اختر فن اور شخصیت نمبر پروفیسر گوپی چند نارنگ

تصور اور نیا تجربہ دیا ہے۔ ایسا تجربہ جو قدیم بھی ہے جدید بھی۔

شاعری کی طرح اختر کی نثر نگاری کی مختلف حیات پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں اعلیٰ درجہ کی تنقیدی صلاحیت تخلیقی جذبہ اور ہنر اور اچھی نثر نگاری کی صلاحیت بہ کمال تمام موجود تھی۔ تبصروں کالم نویسی، مضمون نگاری اور خطوط نویسی میں جو انھوں نے اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں وہ اردو کے نثری ادب کا لائق قدر سرمایہ ہیں نثر نگاری کے سلسلے میں جاں نثار کا زبردست کارنامہ علی جواد زیدی کے دیباچے میں قیوم نظر کی اس سچائی کو ثابت کرنے کی سعی جمیل ہے وہ لکھتے ہیں۔

''اگر ہندوستان کی تمام تاریخی کتابیں ختم کر دی جائیں نیز تمام تحریکات کے تذکرے گم کر دیئے جائیں اور صرف اردو لٹریچر رہ جائے تو آپ ہندوستان کی عہد بہ عہد کی مسلسل تاریخی کڑیوں کو جوڑ سکتے ہیں اور آپ کو صرف اردو کے ذریعے ہندوستان کی مکمل تاریخ سے آگاہی ہو سکتی ہے۔'' [۱]

''اسی طرح دوسری جلد سے دیباچے میں یہ حقیقت بکمال احسن ثابت کی ہے کہ اردو شاعری صرف ہندوستان کی قومی وحدت اور یک جہتی کی شاعری ہے۔ اور یہ کہ اردو شاعری فرقہ پرستی کی لعنت سے ہمیشہ دور رہی ہے'' [۲]

مجموعی طور سے اختر کی نظم و نثر دونوں میں رومانی اذکار کے ساتھ موجودہ طبقاتی نظام سے بیزاری رنگ و نسل اور من و تو کے تصور کے خلاف آواز احتجاج ہے وہ عمل پر زور دیتے ہیں اسی پر ان کا اعتماد ہے۔ اور اسی لیے ہر تنگ و ترشی بے نیازانہ نئی طلوع سحر پر یقین رکھتے ہیں ان

---

۱ ۲ ہندوستان ہمارا علی جواد فریدی دیباچہ مرتبہ جاں نثار اختر

کی مثنوی امن نامہ تحریک امن کی اور جذبہ آشتی واخوت اور اشتراک عمل کا پیغام دیکر محبت کی جوت جگاتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام اور استبراری قوتوں سے نفرت ان کی نثر ونظم دونوں کی اٹوٹ صفات ہیں۔ اردو ادب میں ان کا عطیہ (یوگدان) یقیناً ایک دن نظر استحصان واحترام سے دیکھا جائے گا اور اس طرح جاں نثار اختر کو ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔

کتابیات و رسائل

کتابیات و رسائل

کتابیات کے تحت ان کتابوں اور رسالوں کے نام درج کیے گئے ہیں جن کے براہ راست اقتباسات اس مقالے میں درج کیے گئے ہیں۔ایسی کتب اور رسایل جن سے استفادہ تو کیا گیا ہے۔لیکن ان کے اقتباسات کو شامل مقالہ نہیں ہیں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

آب حیات۔مولانا محمد حسین آزاد مطبوعہ چوتھا ایڈیشن ۱۹۸۸ء اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ

اردو رباعیات۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی نسیم بکڈپو لکھنؤ

اردو میں ترقی پسند تحریک۔ خلیل الرحمٰن اعظمی

تاریخ ادب اردو۔ رام بابو سکسینہ تیج کمار پریس لکھنؤ

ترقی پسند ادب کا پچاس سال۔ مرتب پروفیسر قمر رئیس عاشور کاظمی

پچھلے پہر۔ جاں نثار اختر

جاں نثار اور ان کی شاعری۔ ڈاکٹر ظ انصاری

جاں نثار اختر شخص اور شاعر۔آفاق حسین صدیقی

جاں نثار اختر اور اسکی شاعری۔حفیظ الکبیر

جاں نثار اختر حیات اور فن۔کشور سلطان

جدید اردو شاعری۔ ڈاکٹر عبد القادر سروری

جگت موہن لال رواں حیات اور ادبی خدمات۔ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۸۴ء

حرف آشنا۔ جاں نثار اختر (مکتوبات اختر) مدھیہ پردیس اردو اکیڈیمی بھوپال ۱۹۸۱ء

حیات جاوید حصہ اول ۔ الطاف حسین حالی مظہر لائبریری اینڈ بک سیلرس لکھنؤ

خیمہ گل ۔ محمد علی تارخ

خاموش آواز ۔ مجموعہ خطوط جاں نثار اختر مدھیہ پردیس اردو اکیڈمی بھوپال ۱۹۸۱ء

زیر لب ۔ جاں نثار اختر مرتبہ صفیہ اختر

ساحر اور اس کی شاعری ۔ جاں نثار اختر

ساحر کی شاعری ۔ پرکاش پنڈت

شاعر شہر نگاراں ۔ سید محمد ہاشم

سلاسل ۔ جاں نثار اختر

علمی تاریخ کے اساسی پہلو ۔ نسیم قریشی

فراق اور اس کی شاعری ۔ ڈاکٹر افغان اللہ

کعبہ میں صنم خانہ ۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی نسیم بکڈ پو لکھنؤ ۱۹۶۶ء

گھر آنگن ۔ جاں نثار اختر

نئی نظم کا سفر ۔ خلیل الرحمٰن اعظمی

نئے اور پرانے چراغ ۔ جاں نثار اختر

ہماری شاعری ۔ پروفیسر مسعود حسین رضوی

ہندوستان ہمارا ۔ علی جواد زیدی

ہندی کتب

جیون اور سنکلن ۔ جاں نثار اختر

غیر مطبوعہ مخطوطات

جاں نثار اختر حیات اور ادبی خدمات (مقالہ) سید وہاج الدین اشرف

رسایل و جرائد

اردو معلی۔ (غالب ۲۳ فروری ۱۸۰۴ء کا مکتوب مطبع فاروقی دہلی ۱۹۰۸ء

اردو بلٹز بمبئی۔ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۱ء کے مختلف شمارے

افکار بھوپال۔ ماہنامہ ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۹ء خاص نمبر

افکار بھوپال۔ روز نامہ اپریل ۱۹۳۶ء اور ۲۰ نومبر ۱۹۵۴ء

حمیدیہ کالج بھوپال میگزین خاک دل مکتوب علی سردار جعفری بنام جاں نثار اختر روز نامہ انقلاب بمبئی

علیگڈھ میگزین ۱۹۳۱ء اور جنوری ۱۹۳۶ء اپریل ۱۹۳۶ء کتاب نما دہلی

کردار بھوپال۔ جنوری ۱۹۵۹ء

فلم ویکلی کلکتہ۔ ۵ فروری ۱۹۷۱ء

فلم ویکلی ممبئی۔ (گاتا جائے بنجارہ)

سہ ماہی سفید اردو۔ لیؤن (یوکے) جنوری تا جون ۲۰۰۴ء

شاعر ممبئی۔ ۱۹۵۹ء

شاہکار۔ فراق نمبر

شاعر ممبئی۔ جلد ۴۷ شمارہ ۱

فن اور شخصیت۔ جان نثار اختر نمبر سبھی مضامین

مکتوب صفیہ۔ بنام جاں نثار اختر ۲۴/ دسمبر ۱۹۴۹ء

مکتوب صفیہ۔ بنام جاں نثار اختر ۲۵/ دسمبر ۱۹۵۱ء

نگار اصناف سخن۔ نمبر لکھنؤ ۱۹۵۷ء

نیا ادب۔ لکھنؤ علی سردار جعفری (ترقی پسند تحریک)

نیا دور لکھنؤ۔ یادرفتگاں شمارے مارچ تا ستمبر ۱۹۸۸ء

ندیم بھوپال۔ ۸/ نومبر ۱۹۷۱ء